جمع وتدوین قرآن

قرآن مجید کے جمع وتدوین کی تاریخ پر ایک محققانہ بحث
جس میں نقلی اور عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن
رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بابرکت ہی میں
مدون اور مکمل ہو گیا تھا۔

سید صدیق حسن

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

جمع و تدوین قرآن

قرآن مجید کے جمع و تدوین کی تاریخ پر ایک محققانہ بحث
جس میں نقلی اور عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن
رسالت مآب ﷺ کے عہد بابرکت ہی میں
مدون اور مکمل ہو گیا تھا۔

سید صدیق حسن

دارا ین بی آیدی، ا م لڑھ

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر:۱۱۹

نام کتاب : جمع وتدوین قرآن

مصنف : سید صدیق حسن

صفحات : ۷۸

ایڈیشن : جولائی ۲۰۱۴ء

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو، پی) انڈیا

قیمت : =/40 روپے

باہتمام : عبدالمنان ہلالی

ISBN: 978-93-80104-04-1

Darul Musannefin Shibli Academy
P.O. Box No: 19
Shibli Road, Azamgarh - 276 001 (U.P.)
e-mail: shibli_academy@rediffmail.com
website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

جمع وتدوین قرآن

دیباچہ طبع جدید

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کی اہم مطبوعات میں ''جمع وتدوین قرآن'' شامل ہے۔ اکیڈمی نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس وقت معارف پریس کی طباعت و اشاعت معیاری اور مثالی ہوتی تھی، انقلاب زمانہ سے اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی، مالی دشواریوں کی وجہ سے طباعت کا معیار مستقل گرتا چلا گیا اور اس کے باعث یہاں سے چھپنے والی کتابوں کا پڑھنا مشکل اور ان سے استفادہ دشوار ہوتا چلا گیا۔

دارالمصنّفین نے جب تمام تر دشواریوں کے باوجود اپنی مطبوعات کے جدید اور خوبصورت ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو فطری طور پر علامہ شبلی کی کتابوں اور دوسری اہم مطبوعات کو اولیت دی گئی، المامون، الفاروق، سوانح مولانا روم، سفرنامہ روم ومصر وشام اور خطبات کے نئے ایڈیشن اہتمام سے شائع کیے گئے، اب تک سو سے زیادہ کتابوں کے معیاری ایڈیشن شائع کیے جا چکے ہیں، ''جمع وتدوین قرآن'' کا یہ ایڈیشن بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یقین ہے کہ قدردانان دارالمصنّفین اس نئے قالب میں یہاں کی مطبوعات کی پذیرائی کریں گے۔

اشتیاق احمد ظلی

ڈائریکٹر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ — ۷؍جولائی ۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جمع وتدوین قرآن

قرآن کریم کا ورد تو آپ نے بار ہا کیا ہوگا مگر معلوم نہیں آپ کی نظر کبھی اس طرف بھی گئی یا نہیں کہ سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۸ میں لفظ ''قال''، ''قاف''، ''الف''، ''لام'' سے ''قال'' کی شکل میں لکھا ہوا ہے، دو ہی چار آیتوں کے بعد یعنی آیات نمبر ۱۱۲ اور ۱۱۴ میں یہی لفظ ''قاف ممدودہ'' اور ''لام'' سے ''قٰل'' کی شکل میں لکھا ہوا ہے، اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے مسلمانوں نے اس کے تحفظ میں اتنی احتیاط کی ہے کہ اس کے رسم الخط تک میں کسی تبدیلی کو جائز نہیں رکھا۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں گو قرآن کے رسم الخط میں بعض الفاظ خلافِ قیاس لکھے گئے ہیں لیکن اس سے کوئی خرابی نہیں ہوسکتی کیوں کہ ان الفاظ کا تلفظ سب جانتے ہیں اور یہ مسلمانوں کا کمال تحفظ ہے کہ اس کے باوجود کہ ان چند الفاظ کا رسم الخط درست کردینے میں کوئی نقصان نہ تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور جس طرح صحابۂ کرام کا لکھا ہوا پایا اسی طرح اور بالکل اسی طرح آئندہ نسلوں کو پہنچاتے گئے۔(۱)

قرآن کریم کے قدیم سے قدیم نسخے جو اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں وہ عہد عثمانی کے ہیں، یہ نسخے فاس (دارالخلافہ مراکش)، دمشق، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں موجود ہیں، یہ سب نسخے اور موجودہ متداول قرآنی نسخے بعینہٖ و بجنسہٖ ایک سے ہیں سر مو فرق نہیں، اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں:

---

(۱) تاریخ القرآن از اسلم جیراج پوری، مطبوعہ فیض عام پریس علی گڑھ ۱۹۲۶ء، ص ۵۳۔

"جس رسم الخط کے مطابق یہ (عہد عثمانی کے) مصاحف لکھے گئے،
اب تک برابر اسی طرح لوگ قرآن کو لکھتے چلے آئے ہیں، سرمو فرق نہیں،
صرف پہلے آیت کے ختم کا نشان تین نقطوں (∴) سے ظاہر کرتے تھے
اب اس کی جگہ ایک گول دائرہ (○) بناتے ہیں۔" (تاریخ قرآن)

اس سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ عہد عثمانی میں جس طرح قرآن کو لکھا گیا تھا بالکل اسی طرح امت مسلمہ آج تک اس کو لکھتی چلی جاتی ہے، اس نے نہ تو خلافِ قیاس لکھے ہوئے الفاظ کے رسم الخط میں کوئی تبدیلی کی اور نہ ترتیب آیات وسور میں، ظاہر ہے کہ جو امت رسم الخط میں بھی اس لیے اصلاح پسند نہ کر سکی کہ مجوزہ رسم الخط صحابہؓ کے رسم الخط کے مطابق نہ تھا وہ ترتیب آیات وسور کیسے بدل سکتی تھی۔

غور کیجیے تو یہ ایک سلبی شہادت ہے جس کا سلسلہ عہد عثمانی تک ہی پہنچتا ہے، اس وقت تک جو پرانے سے پرانے نسخے ملے ہیں وہ عہد عثمانی کے پہلے کے نہیں ہیں، اس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عہد عثمانی سے پہلے قرآن کی کتابت کی کیا ہیئت تھی، یہ ایک بڑا خلا ہے۔

اس نتیجہ کی بنیاد اس استدلال پر ہے کہ چوں کہ دریافت شدہ مصاحف میں اور آج کے مصاحف میں ترتیب وتدوین حتیٰ کہ رسم الخط تک بعینہٖ ایک ہے، اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ عہد عثمانی سے پہلے بھی اس کے علاوہ کوئی اور رسم الخط یا کوئی اور ترتیب کلام الٰہی کی نہ تھی، گو شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے عہد عثمانی میں مصاحف کے ان نسخوں کو جو نسخۂ عثمانی کے مطابق نہ تھے اس طرح ضائع کر دیا گیا کہ اب اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

مگر اس سے کوئی ایجابی ثبوت اس بات کا نہیں ملتا کہ آج جو قرآن بین الدفتین ہمارے پاس ہے وہ بغیر کسی ادنیٰ اختلاف کے وہی ہے جو امت کے لیے رسالت پناہؐ نے آخری بار مرتب فرمایا تھا بلکہ بعض روایتیں ایسی ملتی ہیں جن پر سطحی نظر ڈالنے سے اس کا گمان ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے متن میں کوئی کمی بیشی نہ ہوئی ہو لیکن کم از کم ترتیبِ سور وہ نہیں ہے جو آنحضرت ﷺ کے عہد میمنت مہد میں تھی۔

یہ محض واہمہ نہیں بلکہ سلف میں بھی ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کی دیانت داری

کے ساتھ یہ رائے تھی کہ موجودہ ترتیبِ سور توقیفی نہیں بلکہ اس کام کو رسول اکرم ﷺ نے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

اس خیال کی تائید میں وہ تمام روایتیں آتی ہیں جن میں صحابۂ کرامؓ کے مختلف مصاحف کی ترتیب جدا جدا بتائی گئی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے مصاحف کی ترتیب تو تفصیل کے ساتھ معلوم ہے بلکہ بعض مصاحف کی سورتوں کی تعداد بھی مختلف بتائی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق تو بڑے شد و مد سے کہا جاتا ہے کہ آپ کے مصحف میں معوذتین نہ تھیں اور عیاذاً باللہ آپ انہیں جزو قرآن ہی نہ سمجھتے تھے اور اس میں آپ کو اس قدر شدت تھی کہ اگر ان کو قرآن میں کوئی لکھ دیتا تھا تو اسے "حک" کر دیتے تھے، چھیل ڈالتے تھے، وہ انفال اور برأت کو علاحدہ سورتیں نہ مانتے تھے، سورۂ فاتحہ کو قرآن سے الگ ایک دعا تصور کرتے تھے، اس طرح ان کے مصحف میں ۱۱۴ سورتوں کے بجائے ۱۱۰ سورتیں تھیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف میں ۱۱۴ کے اوپر دو سورتیں اور تھیں جو جمہور کے نزدیک قنوت کی دعائیں ہیں اور قرآن سے الگ ہیں۔

ان دونوں بزرگوں کے مصاحف میں ترتیبِ سور بھی موجودہ ترتیب سے مختلف تھی، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

وقال القاضی عیاض فی شرح حدیث حذیفةؓ ان النبیؐ قرأ فی صلوٰته فی اللیل بسورة النساء قبل سورة ال عمران ھو کذلك فی مصحف ابی بن کعبؓ وفیه حجة لمن یقول ان ترتیب السور اجتھاد ولیس بتوقیف من النبیؐ وھو قول	قاضی عیاض حضرت حذیفہؓ والی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے سورۂ آل عمران سے پہلے سورۂ نساء کو رات کی نماز میں پڑھا ہے اور ایسا ہی مصحف ابی بن کعبؓ میں بھی ہے اور یہ بات ان لوگوں کے لیے حجت ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب اجتہادی ہے، رسول اکرم

جمهور العلماء واختاره القاضي الباقلاني قال وترتيب السور ليس بواجب في التلاوة ولا في الصلوٰة ولا في الدرس ولا في التعليم فلذلك اختلف المصاحف فلما كتب مصحف عثمان رتبوا على ماهو عليه الآن، فلذلك اختلف ترتيب مصاحف الصحابة۔(۱)

علیہ کی طرف سے توقیفی نہیں ہے اور یہی جمہور علما کا قول ہے، اسی کو باقلانی نے بھی اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ سورتوں کی ترتیب نہ تلاوت میں واجب ہے نہ ہی نماز میں اور نہ تدریس وتعلیم میں، اسی بنا پر مصاحف مختلف ہوگئے ہیں، جب مصحف عثمانی لکھا گیا تو اس کو اس شکل میں مرتب کر دیا جو اس وقت موجود ہے، اسی بنا پر صحابہ کرامؓ کے مصاحف کی ترتیب میں بھی خاصہ اختلاف ہو گیا۔

فتح الباری کی اوپر والی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہور علما کا یہ خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورتوں کی ترتیب نہیں فرمائی تھی۔

جمہور علما کا نہ بھی سہی مگر کم سے کم ایک گروہ کا اس کے برخلاف یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی آیات وسورتوں کی ترتیب وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے فرمائی تھی۔

مگر عقیدہ اور ایمان اپنی جگہ پر کتنا ہی اہم سہی لیکن اس بات کی کوئی عقلی یا نقلی شہادت نہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ایمان وعقیدہ سے صرف نظر کرکے اس کی عقلی اور نقلی شہادتوں پر غور کر لیا جائے۔

ترتیب قرآن کے دو پہلو ہیں: ۱۔ترتیب آیات سور میں ۲۔ترتیب سور مصحف میں ان پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو سے پہلے بہتر ہوگا کہ دو ایک تاریخی مسلمات ذہن نشین کر لیے جائیں۔

۱۔قرآن بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوا۔

۲۔آخری آیت کے نزول کے نو (۹) دن بعد آنحضرت ﷺ کا وصال ۱۱ھ میں ہوا۔

۳۔جنگ یمامہ ۱۲ھ کے لگ بھگ ہوئی۔

(۱) فتح الباری، شرح بخاری مطبوعہ مصر، ج۹ ص ۳۶۔

۴۔آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جزیرۃ العرب کے بیشتر حصہ میں اسلام پھیل چکا تھا۔

اس تاریخی حقیقت پر سب متفق ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں عرب میں لکھنا بہت ہی محدود لوگوں کو آتا تھا، بعض مؤرخوں نے مسلمان لکھنے والوں کی تعداد بھی مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، ممکن ہے کہ یہ تعداد تاریخی طور پر ثابت نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ لکھنا جانتے تھے ان کا فدیہ لڑکوں کو لکھنا سکھا دینا ہی قرار دیا گیا تھا، یہ اس کا ثبوت ہے کہ اس زمانہ میں صرف خال خال لوگ لکھنا جانتے تھے۔

اس کے علاوہ آج تک یہ عربوں کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ اپنی قوت حافظہ پر نہ صرف بھروسہ بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں، پچھلے دنوں کی بات ہے میں ڈھاکہ میں تھا، وہاں ایک نوجوان عرب سے ملاقات ہوئی جو جدہ ریڈیو میں نشریات کے افسر ہیں، رسمی تعارف کے بعد انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میں ان سے حج کے دوران ۵۹ھ میں ملا تھا، یہ تو خیر کوئی ایسی بات نہ تھی، اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میں نے جدہ ریڈیو سے ایک گفتگو نشر کی تھی، یہاں تک بھی غنیمت تھا، مگر جب انہوں نے گفتگو کی تفصیل مجھے بتانی شروع کی اور میری یاد نے اس کی تصدیق کی تو میں ان کی قوت حافظہ پر متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، آپ خیال کیجیے کہ حج کے زمانہ میں کتنی ہما ہمی ہوتی ہے، اولاً تو حج کا پروگرام بہت زیادہ نشر ہوتا ہے، پھر حکومت کے امراوغیرہ کی تقریریں اور پیام نشر ہوتے ہیں، پھر باہر سے آنے والوں کی خاصی تعداد ایسی ہوتی ہے جن کے تاثرات نشر کیے جاتے ہیں، اس پروگرام کے جنگل میں ایک معمولی تقریر کو یاد رکھنا اور وہ بھی جب تین سال کا زمانہ گزر چکا ہو اور جب تقریر کرنے والے سے اس کے دیس میں نہیں بلکہ پردیس میں ملاقات ہو اور اس کی تقریر کی تفصیل پیش کر دی جائے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

یہ واقعہ تو اس زمانہ کا ہے جب لکھنے پڑھنے کی اتنی فراوانی ہے کہ اب کسی چیز کو حافظہ میں محفوظ رکھنا بالکل ضروری نہیں، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تو پڑھے لکھے بہت کم تھے، خاص خاص چیزوں کو چھوڑ کر آپس کا لین دین تک بس زبانی معاہدوں ہی کی شکل میں

ہوتا تھا، اسی بنا پر یہ ہدایت فرمائی گئی تھی:

اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ (البقرہ۲:۲۸۲) اگر ادھار کا معاملہ ایک مدت معینہ کے لیے کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

ظاہر ہے کہ اگر پہلے سے لوگ لکھ لینے کے عادی ہوتے تو اس ہدایت کی ضرورت نہ تھی، اس زمانہ میں تو سارا دارومدار یادداشت پر تھا، عام طور پر عرب اس پر بڑا فخر کرتا تھا کہ اسے فلاں فلاں اقوال، قصیدے، شجرے زبانی یاد ہیں، پشتہا پشت کے لمبے لمبے شجرے انہیں برزبان رہتے تھے، انسانوں ہی کے نہیں اونٹوں اور گھوڑوں تک کے، ان کے بڑے بڑے میلے گویا اس قوت یادداشت کے ٹورنامنٹ ہوتے تھے، لوگ قصیدے سناتے، انساب بیان کرتے، بزرگوں کے کارنامے دہراتے، کسی بات کو لکھ کر کتاب کی شکل میں محفوظ کرنا قوت حافظہ کی کمزوری سمجھا جاتا تھا۔

تاہم یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مکہ ہی میں جب کہ مسلمان بے بس اور بہت ہی قلیل تعداد میں تھے قرآن کی جو آیات نازل ہوتیں ان کو لوگ یاد تو کر ہی لیتے مگر کچھ لوگ لکھ بھی لیتے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا واقعہ اس سلسلہ میں مشہور ہے کہ آپ نے سورۂ طٰہٰ کی آیتیں اپنی بہن کے یہاں لکھی دیکھی تھیں، سر ولیم میور لکھتے ہیں:

> ''اس امر کے باور کرنے کی وجہ معقول ہے کہ بہت سی حجری نقلیں جن میں قرآن شامل تھا، مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی حیات (طیبہ) میں لکھ لی تھیں اگر اس قدیم زمانہ (حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت) میں قرآن کی آیتیں لکھ لی جاتی تھیں اور عام تھیں، درانحالیکہ مسلمان کم اور مظلوم تھے، اس سے یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب پیغمبر کو قوت ہوئی اور یہ کتاب اکثر ملک عرب کے لیے شریعت قرار پائی تو اس وقت قرآن کے نسخے کثرت سے بڑھ گئے ہوں گے۔''

سر ولیم میور کی تو یہ رائے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت تک قرآن کے

نسخے کثرت سے بڑھ گئے ہوں گے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مکمل اور مرتب قرآن بھی بہت سے صحابہ کے پاس موجود تھا بلکہ بخاری کی ایک روایت سے یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ صرف چار بزرگوار ایسے تھے جن کے پاس پورا قرآن تھا، بقیہ کے پاس پورا قرآن نہ تھا بلکہ اس کے متفرق اجزا تھے، اس روایت کا متعلقہ ٹکڑا حسب ذیل ہے:

مات نبی ولم یجمع القران غیر اربعة، ابوالدرداءؓ ومعاذ بن جبلؓ وزید بن ثابتؓ وابوزیدؓ	آنحضرت ﷺ کا وصال ہوگیا لیکن چار حضرات کے سوا کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا تھا، یہ ابوالدرداؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ اور ابوزیدؓ تھے۔

اس روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ یہ جو چار نسخے کلام مجید کے تھے، ان کی ترتیب کیسی تھی، اتقان میں زید بن ثابتؓ کی زہری کے توسط سے یہ روایت ملتی ہے:

قال الدیرعا قولی فی فوائده حدثنا ابراهیم بن بشارثنا سفیان بن عیینة عن الزهری، عن زید بن ثابت قال قبض النبیؐ ولم یجمع القران فی شیئ	دیرعا قولی اپنے فوائد میں لکھتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم بن بشار نے اور ان سے سفیان بن عیینہ نے زہری کے حوالے سے بیان کیا اور وہ زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا وصال ہوگیا مگر قرآن کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔

اس روایت کے سلسلے میں سیوطی لکھتے ہیں:

(قال) الخطابی انما لم یجمع صلی اللّٰه علیه وسلم القران فی المصحف لما کان یترقبه من ورود ناسخ لبعض احکامه او تلاوته فلما انقضیٰ نزوله بوفاته الهم اللّٰه الخلفاء الراشدین ذلك	خطابی کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کو مصحف میں اس وجہ سے جمع نہیں کیا تھا کہ آپ کو انتظار تھا کہ مبادا بعض احکام منسوخ ہو جائیں یا بعض آیات کی تلاوت منسوخ ہوجائے، اس لیے جب آپ کی وفات کے بعد نزول قرآن کا سلسلہ ختم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ

نے خلفائے راشدین کے قلب میں یہ بات
ڈال دی۔

ابوسعید خدری کی حدیث کے بارہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

واما ما اخرجه مسلم من حديث ابي سعيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تكتبوا عني شيئا غير القران، فلاينا في ذلك لان الكلام في كتابة مخصوصة على صفة مخصوصة وقد كان القران كتب كله في عهد رسول الله ﷺ لكن غير مجموع في موضع واحد ولا مرتب السور	رہی وہ روایت جو کہ امام مسلم نے ابی سعید کی حدیث کے سلسلے میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے بجز قرآن کے کوئی اور چیز نہ لکھا کرو تو یہ اس کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ بحث تو ایک مخصوص کتابت اور خاص صفت کے ساتھ لکھنے کے متعلق ہے اور قرآن مجید پورے کا پورا رسول اکرمؐ کے عہد مبارک میں لکھا جا چکا، البتہ ایک جگہ جمع نہیں تھا اور نہ سورتوں کی ترتیب تھی۔

حاکم نے مستدرک میں تین مرتبہ ''جمع قرآن'' کا تذکرہ کیا ہے، ایک آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں، دوسرے حضرت ابوبکرؓ کی موجودگی میں اور تیسرے حضرت عثمانؓ کی موجودگی میں۔

وقال الحاكم في المستدرك جمع القران ثلاث مرات (احداها بحضرة النبي ﷺ ثم اخرج السنن على شرط الشيخين عن زيد ابن ثابت قال كنا عند رسول الله ﷺ مؤلف القران من الرقاع الحديث (قال) البيهقي يشبه ان يكون المراد به	حاکم مستدرک میں کہتے ہیں قرآن کی جمع و تدوین تین مرتبہ ہوئی، ایک نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں، پھر حاکم امام بخاری و مسلم کی شرط پر حدیث کا استخراج کرتے ہوئے زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں رقاع سے قرآن کو جمع کرتے

تالیف ما نزل من الآیات المفرقة فی سورها وجمعها فیھا باشارة النبیؐ (الثانیة) بحضرة ابی بکرؓ

کرتے تھے، بیہقی فرماتے ہیں کہ تالیف سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جو متفرق و منتشر آیتیں نازل ہوتی تھیں انہیں آنحضرتؐ کی ہدایت کے مطابق سورتوں میں جمع کر دیتے اور دوسری مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کی موجودگی میں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

(واخرج) ابن ابی داؤد من طریق ہشام بن عروة عن ابیه ان ابابکر قال لعمر ولزید اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاھدین علی شیئ من کتاب اللّٰه فاکتباہ (قال) السخاوی فی جمال القراء المراد انھما یشھدان علی ان ذلك المکتوب کتب بین یدی رسول اللّٰهﷺ (قال) ابوشامة وکان غرضھم ان لایکتب الا من عین ما کتب بین یدی رسول اللّٰه لا من مجرد الحفظ قال ولذلك قال فی اٰخر سورة التوبة لم اجدھا مع غیرہ لم اجدھا مکتوبة مع غیرہ لانه کان لا یکتفی بالحفظ دون الکتابة

ابن ابوداؤد، ہشام بن عروہ عن ابیہ کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے عمرؓ اور زیدؓ سے فرمایا کہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص تم دونوں کے پاس کتاب اللہ کی کسی آیت کے متعلق دو شاہدوں کو پیش کرے اسے لکھ لیا کرو، حافظ سخاوی جمال القرا میں فرماتے ہیں کہ اس شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ مکتوب آیت رسول اکرمﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی، ابوشامہ کہتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ صرف وہی چیزیں اور بعینہٖ اسی طریقہ سے لکھی جائیں جس طرح رسول اکرمﷺ کے سامنے لکھی گئی تھیں، صرف حافظہ کے بھروسے پر نہ لکھا جائے، اسی بنا پر کہا کہ میں نے سورۂ توبہ کے آخری حصہ کو اس کے علاوہ نہیں پایا، یعنی میں نے اس کو کسی اور سورہ کے ساتھ لکھا ہوا نہیں پایا، اس لیے کہ یہ صرف یاد کرنا ہی کافی نہ تھا بلکہ لکھنا بھی ضروری تھا۔

(الرقاع جمع رقعة وقد تکون (۱) من جلد او رق او کاغذ)

رقاع رقعہ کی جمع ہے جو کسی پتلے چمڑے یا کاغذ کا ہوتا۔

حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن کے متعلق جو روایت اس سلسلہ میں ابن اشتہ کی ہے اس کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

فاجتمعوا فکتبوا فکانوا اذا اختلفوا وتدارؤا فی ای اٰیة قالوا ھذہ اقراھا رسول اللّٰہ ﷺ فلانا فیرسل الیه وھو علی (۲) رأس ثلاث من المدینة فیقال له کیف اقراك رسول اللّٰہ ﷺ اٰیة کذا وکذا، فیقول کذا وکذا فیکتبونها

پس وہ لوگ جمع ہوئے اور قرآن کو لکھا، جب ان میں کسی آیت کے بارے میں اختلاف ہوتا تو کہتے کہ اس کو رسول اکرم ﷺ نے فلاں شخص کو پڑھایا ہے تو اسے بلا بھیجتے اور وہ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر رہتا تھا، اس سے پوچھا جاتا کہ تم کو رسول اللہ ﷺ نے فلاں فلاں آیت کو کس طرح پڑھایا ہے، وہ جس طرح بتاتا اسی طرح لکھ لیتے۔

قال البغوی فی شرح السنة وکان رسول اللّٰہ ﷺ یلقن اصحابه ویعلمھم ما نزل علیه من القراٰن علی الترتیب الذی ھو الاٰن فی مصاحفنا بتوقیف جبریل ایاہ علی ذلك

بغوی شرح السنۃ میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جب قرآن نازل ہوتا تو آپ صحابہ کرام کو اس کی تلقین کرتے اور اسی ترتیب کے مطابق اس کی تعلیم دیتے جس ترتیب کے مطابق اس وقت ہمارے مصاحف میں موجود ہے اور وہ حضرت جبرئیلؑ کی جانب سے توقیفی ہے۔

(وقال) الکرمانی فی البرھان وکان اٰخر الاٰیات نزولاً "وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ "فامرہ جبریل

کرمانی برہان میں کہتے ہیں نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت جو نازل ہوئی وہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ہے،

---

(۱) اتقان، مطبوعہ مصر با نوع ثانی عشر فی جمعہ وترتیبہ، ص ۶۰۔ (۲) ایضاً ص ۶۱۔

ان یضعها بین أیتی الرباء والدین(۱)

آپ کو جبریل نے بتایا کہ اس آیت کو الربا اور الدین کی آیتوں کے وسط میں رکھیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

(وقال البیهقی فی المدخل) کان القران علی عهد النبیؐ مرتبا سورة و أیاته علی هذه الترتیب الا الانفال والبرأة

بیہقی مدخل میں کہتے ہیں کہ قرآن کریم نبی کریمؐ کے عہد مبارک میں موجودہ ترتیب کے مطابق سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے ساتھ مرتب تھا بجز انفال و برأت کے۔

اسی طرح ابوجعفر النحاس کہتے ہیں کہ:

ان تالیف السور علی هذا الترتیب لحدیث واثلة (وقال) ابن الحصار ترتیب السور ووضع الأیات موضعها انما کان بالوحی

سورتوں کی تالیف اس ترتیب کے ساتھ واثلہ کی روایت سے ثابت ہوتی ہے، ابن الحصار کہتے ہیں سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کو ان کی جگہ پر رکھنا وحی کے ذریعہ سے تھا۔

سیوطی کا خود رجحان ان کے الفاظ میں یہ ہے:

ان جمیع السور ترتیبها توقیفی الا براءة والانفال (۲)

کل سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے بجز سورۂ برأۃ اور انفال کے۔

اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے عبداللطیف رحمانی لکھتے ہیں: (۳)

علامہ ذہبی طبقات القرا میں لکھتے ہیں:

فاما من حفظه کله منهم وعرض علی النبی فجماعة من نجباء اصحاب محمدؐ انتدبوا لاقرائه...... وکان سبعة ائمة اعلام دارت علیهم اسانید القران

جن لوگوں نے کل کلام پاک حفظ کرلیا تھا اور اس کو انہوں نے نبی اکرمؐ کے سامنے پیش کیا وہ رسول اکرمؐ کے ممتاز اصحاب کی ایک جماعت ہے، اس نے اپنے کو قرأت کے لیے مخصوص کرلیا تھا، ان میں سات نامور شخصیتیں تھیں

(۱) اتقان، مطبوعہ مصر با نوع ثانی عشر فی جمعہ وترتیبہ، ص ۶۰۔ (۲) ایضاً، ص ۶۵۔ (۳) تاریخ القرآن، ص ۴۶۔

جن کے گرد قرآن کی سند گھومتی ہے۔

یعنی صحابہ میں جن کو پورا قرآن یاد تھا اور آنحضرتؐ کو بھی انہوں نے تمام سنایا تھا، وہ جلیل القدر صحابہؓ کی ایک ایسی جماعت تھی جو قرآن کو پڑھاتی تھی، منجملہ انہیں کے قراءِ سبعہ بھی ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''علامہ ابن سعد نے بھی طبقات قسم ثانی، جلد ۲، ص ۱۱۲ میں بعض ایسے صحابہ کے نام شمار کیے ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی زندگی میں پورا قرآن جمع کیا تھا۔''

اس کے بعد طبقات کی وہ پوری عبارت نقل کی ہے جس میں دس اصحاب کرامؓ کے نام ہیں۔

آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں حفاظ کا چار سے زیادہ ہونا ایسا یقینی اور مضبوط امر ہے جس میں کسی قسم کے احتمال اور شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔(۱)

شاہ معین الدین لکھتے ہیں:(۲)

''صحابۂ کرام میں بہت سے بزرگ ایسے تھے جنہوں نے پورا کلام مجید جمع اور حفظ کیا تھا۔''

پھر بخاری کی حضرت انسؓ والی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بخاری کے اسی باب کی دوسری روایت میں ابی بن ابن کعبؓ کے بجائے حضرت ابودرداؓ کا نام ہے، کنز العمال میں طبرانی اور مستدرک کے حوالہ سے جامعین قرآن میں ایک نام سعید بن عبید کا بھی ہے، ان میں حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ کے پوری قرآن کی جمع وتدوین تو تاریخی مسلمات میں ہے، ان بزرگوں کے مرتب کردہ مصاحف مدتوں موجود رہے، ممکن ہے کہ اب بھی ان کا کوئی نسخہ کہیں پایا جاتا ہو، ابن ندیم اور سیوطی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کے مصاحف خود دیکھے تھے اور فہرست واتقان

(۱) تاریخ القرآن، ص ۴۸۔ (۲) ماہنامہ صبح صادق ۱۹۵۶ء، قرآن نمبر، ص ۱۴۲۔

میں ان کی سورتوں کے نام اور ترتیب نقل کی ہے، ان میں اور موجودہ مصحف میں صرف یہ فرق ہے کہ ان مصاحف کے سورتوں کے بعض نام اور ترتیب مصحف عثمانی سے مختلف ہے۔

حضرت علیؓ کے مرتب کردہ قرآن کی ترتیب نزولی تھی۔

اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں:(۱)

''مشہور حفاظ صحابہ جنہوں نے پورا قرآن یاد کیا اور بہتوں نے لکھ بھی لیا تھا(یہ ہیں): مہاجرین میں خلفائے اربعہؓ طلحہؓ سعدؓ، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، سالمؓ مولیٰ حذیفہؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن سائبؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عائشہ صدیقہؓ، حفصہؓ، ام سلمیٰؓ۔

اور انصار میں: عبادہ بن الصامتؓ، ابوحلیمہؓ، مجمع ابن جاریہؓ، (دو سورتیں کم)، فضالہ بن عبیدؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، تمیم داریؓ، عرضیہ بن عامرؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ۔''

ان سب روایتوں پر بہ یک وقت نظر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں تک پورے قرآن کی زبان یاد کر لینے کا تعلق ہے، چار سے بہت زیادہ صحابہ کرامؓ کو یہ شرف حاصل تھا، بخاری کی جو روایت ہے اس میں ''جمع قرآن'' سے مطلب قرآن کو کتابی شکل میں لکھ کر جمع کر لینا معلوم ہوتا ہے۔

خود بخاری ہی میں ایک روایت ہے جس میں چار کے علاوہ پانچواں نام بھی ہے، اگر جمع قرآن سے حفظ قرآن مراد ہے تو اور جو دوسری روایتیں ملتی ہیں ان کو چھوڑ دینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اس لیے یہ نتیجہ بعید از قیاس نہیں آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں چار سے زائد صحابہ کرامؓ نے پورا قرآن زبانی یاد کر لیا تھا اور کم از کم چار بزرگ ایسے تھے جن کے پاس پورا قرآن لکھا ہوا موجود تھا لیکن ان تمام روایات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کے وقت میں پورا قرآن اسی ترتیب سے جمع ہو گیا تھا جیسا کہ اب ہے۔

اس پہلو سے غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ

(۱) تاریخ القرآن، ص ۵۰۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جنگ یمامہ کے بعد جو ۱۲ھ کے قریب ہوئی قرآن مجید کو اسی ترتیب سے مدون کر دیا تھا جیسا کہ اب ہے اور جو شہادت ترتیب قرآن کی ۱۲ھ کے بعد کی ہے وہ اس امر کو ثابت نہیں کرتی کہ ۱۱ھ میں جب آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تھا ترتیب قرآن وہی تھی جو ۱۲ھ میں زید بن ثابتؓ کی ترتیب تھی۔

دوسری بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ قرآن مجید بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوا ہے اور جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آنحضرت ﷺ اس کو لکھا دیا کرتے تھے، صحابہ کو یاد کرا دیتے اور ان سے سن بھی لیتے تھے، اس سے بھی اہم یہ ہے کہ اس آیت کا مقام آپ متعین فرما دیتے تھے اور چونکہ یہ مقام وحی سے متعین ہوتا تھا اس لیے اس کا کوئی ظاہری قاعدہ نہیں تھا، ایسا نہیں تھا کہ جو آیت آج نازل ہوئی ہے وہ کل والی آیت کے بعد رکھی جائے، یہ بھی نہیں تھا کہ نفس مضمون کے تعین سے کسی دوسری ہم مضمون آیت کے ساتھ اول یا بعد لکھی جائے، یہ بھی نہیں تھا کہ آپ اپنے قد و قامت کے لحاظ سے جگہ پاتی ہو بلکہ ہر آیت کا ایک الہامی ربط اور ایک الہامی مقام ہوتا تھا جس کی رو سے وہ آیت بالکل اسی جگہ چسپاں ہو سکتی تھی، ممکن ہے سطحی نظر سے وہ ربط اور تسلسل نظر نہ آتا ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا کوئی طریقہ کار متعین نہیں تھا، یہ بھی ضروری نہیں کہ چونکہ شارع علیہ السلام نے اس کا نظام عمل لوگوں کو بتایا نہیں اس لیے سرے سے اس کا کوئی نظام ہی نہ رہا ہو، اس میں شک نہیں کہ سرسری نگاہ میں وہ باریک اور بلند نظام نظر نہیں آتا مگر جن لوگوں نے اس کی چھان بین کی ہے وہ اس نتیجہ پر بدلائل قوی پہنچے ہیں کہ قرآن کی ترتیب کا ایک خاص نظام ہے، اسی کے ماتحت اس کی ترتیب عمل میں آئی ہے۔

بہر حال یہ ایک علاحدہ بحث ہے جس پر انشاء اللہ بعد میں روشنی ڈالی جائے گی، فی الحال موجودہ بحث کو تین مقدمات میں تقسیم کر لیجیے:

۱۔ کیا آیات کی ترتیب سورتوں میں آنحضرت ﷺ نے متعین فرمائی تھی۔

۲۔ کیا مختلف سورتوں کا تعین خود حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا۔

۳۔ کیا سورتوں کا باہمی نظم خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا۔

جہاں تک مقدمۂ اولیٰ کا تعلق ہے اس کے متعلق اتنی احادیث صحیحہ ہیں کہ تمام علمائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب خود آنحضرت ﷺ نے وحی الٰہی کے مطابق فرمائی تھی۔

شاہ معین الدین ندوی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:(۱)

> ''اس پر اجماع ہے اور یہ نصوص متواترہ سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب بغیر کسی شک وشبہہ کے توقیفی ہے، اس کو بہت سے علما نے نقل کیا ہے، زرکشی نے برہان میں اور ابوجعفر زبیر نے مناسبات میں لکھا ہے کہ آیات کی ترتیب سورتوں میں رسول اللہؐ کی توقیف اور حکم کے مطابق ہوئی، اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں۔''

قاضی ابوبکر نے الانتصار میں لکھا ہے کہ آیات کی ترتیب واجب اور حکم لازم ہے، آنحضرت ﷺ کو حضرت جبرئیلؑ بتاتے تھے کہ فلاں آیت فلاں مقام پر رکھی جائے۔

اس کے متعلق اس کثرت سے احادیث ہیں کہ سب کو نقل کرنا طویل ہوگا، صرف تین حدیثیں بطور نمونہ یہاں لکھی جاتی ہیں:

۱۔ قال عثمان کان رسول اللہ مما یاتی علیه الزمان وهو ینزل علیه السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیه الشیئ دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا هؤلاء الأيات فی السورة التی یذکرفیها کذا وکذا، فاذا نزلت علیه الأية فیقول ضعوا هذه الأية فی سورة یذکر فیها	حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات رسول اکرم ﷺ پر متعدد سورتیں (یعنی مختلف سورتوں کی آیات) بیک وقت نازل ہوتی تھیں، جب ایسی صورت ہوتی تھی تو آپ ان لوگوں کو جو لکھنا جانتے تھے بلاتے اور فرماتے کہ ان آیتوں کو فلاں فلاں سورۃ میں اس اس جگہ رکھو اور جب آپؐ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے کہ اس آیت کو اس سورۃ میں رکھو جس کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہوتا۔

(۱) صبح صادق قرآن نمبر، ۱۹۵۶ء۔

۲۔ دوسری حدیث مسند ابن حنبل میں عثمان بن ابی العاص سے مروی ہے جس کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اتانی جبرئیل فامرنی ان اضع هذه الآية هذا الموضع من هذه السورة اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ	میرے پاس جبرئیل آئے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کو جو اسی موضوع سے متعلق ہے اس سورۃ میں رکھو، وہ آیت یہ تھی اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ......

۳۔ تیسری حدیث یہ ہے:

......لما نزلت لَايَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قال النبی ﷺ ادع لی زید او ليجیئ باللوح والقلم والكتف أوالكتف والدواه ثم قال اكتب لَايَسْتَوِی ......(۱)	جب لَايَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ نازل ہوئی تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ اور وہ تختی اور قلم اور کتف اور دوات لے کر آئیں، پھر فرمایا کہ لکھو لَايَسْتَوِی الخ

ان حدیثوں کو نظر میں رکھنے سے اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ جیسے ہی کوئی آیت نازل ہوتی تھی آنحضرت ﷺ بحکم وحی اس کا مقام متعین فرمادیتے، اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ آپ کسی کاتب وحی کو جو فوراً دستیاب ہوتا بلا کر لکھا دیتے، اس طرح کاتب وحی کے پاس اس وقت تک نازل شدہ قرآن کا نسخہ فراہم ہوتا جاتا تھا۔

اس میں میں نے دو اہم باتوں کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ نزول وحی جس دم ختم ہوجاتا اس کے معاً بعد حضور اکرم ﷺ نازل شدہ قرآن کا جز لکھا دیتے۔

۲۔ اس طرح تا آں وقت نازل شدہ قرآن کا ایک مکمل نسخہ کاتب وحی کے پاس مرتب ہوجاتا۔

(۱) بخاری، ج ۲، مرتبہ نائب نقوی، ۵۸ء ایڈیشن، ص ۸۴۶، باب ۴، حدیث نمبر ۱۱۔

پہلی گزارش کے متعلق مجمع الزوائد سے زید بن ثابتؓ کی روایت پیش کی جاسکتی ہے کہ روحی فداہ ﷺ سے جب کیفیت وحی جاتی رہتی تو فکنت ادخل علیہ بقطعۃ الکتف فاکتب ......

اوپر لکھی ہوئی احادیث میں بخاری والی احادیث اس موضوع پر بہت صاف ہے کہ کیفیت وحی ختم ہوتے ہی سرور کائنات ﷺ نے زید بن ثابتؓ کو بلانے کا حکم دیا بلکہ اس کا آخری ٹکڑا جو ابن ام مکتومؓ سے متعلق ہے اس سے تو یہاں تک ترشح ہوتا ہے کہ نزول وحی کے بعد اس قدر جلد اس کی کتابت کرادی جاتی کہ اس کے درمیان میں اتنا وقفہ نہیں گزرتا تھا کہ کسی اور تک وہ آیت پہنچ سکے یا سنائی جاسکے۔

ان احادیث کی تائید میں سب سے بڑی دلیل خود قرآن کریم میں ملتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بتقاضائے فرض نبوت اس کی بڑی جلدی رہتی تھی کہ جیسے ہی وحی نازل ہو آپؐ اسے محفوظ فرمالیں، اس ذہنی کیفیت کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے:

لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (الدہر ۷۶: ۱۶، ۱۷)

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے۔

اس خط کشیدہ ٹکڑے پر غور فرمایئے، وحی نازل ہو رہی ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ مہبط وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام زبان کو حرکت دے رہے ہیں اور اس کو یاد کرتے ہیں ''تعجیل'' جلدی سے کام لے رہے ہیں، حدیث عثمانیؓ پر غور کرتے وقت اس کیفیت کو سامنے رکھیے تو یہ بات بالیقین ثابت ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی ختم ہوتے ہی آیت یا سورۂ متعلقہ کو لکھا دیتے تھے جو کیفیت مبارکہ نزول وحی کے دوران میں اس نیت سے زبان کو حرکت دلاتی اور اس کو یاد رکھنے میں جلدی کرتی تھی کہ کہیں نازل شدہ قرآن کا خدانخواستہ کوئی شمہ نہ رہ جائے، کیا اس سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ نزول وحی کے بعد وہ اس بات میں توقف اور بھی بلاضرورت توقف کرے گی کہ نازل شدہ آیت کو کسی اور موقع سے لکھا دیا

جائے گا اور یہ توقف کیوں کیا جاتا، اس کی حاجت ہی کیا ہو سکتی تھی۔

دوسری بات جو میں نے عرض کرنے کی جسارت کی ہے یہ ہے کہ اس طرح اس وقت تک نازل شدہ قرآن کا ایک پورا نسخہ کاتب وحی کے پاس مرتب ہوتا جاتا تھا۔

صحابہ کرامؓ کو آنحضرت ﷺ کے اقوال کو یاد اور قلم بند کر لینے میں اس قدر شغف اور انہماک تھا کہ آپ کو باصرار کہنا پڑا کہ "لا تکتبوا عنی غیر القران" مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھو، اس سے یہ نتیجہ بعید از قیاس نہ ہوگا کہ صحابہ کرامؓ غیر قرآن کو تو محض یاد کے حوالے کرتے تھے مگر قرآن کو لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔

اس سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حدیثیں نہیں لکھیں، یہ ایک علاحدہ بحث ہے اور پیش نظر بحث سے اس کو کوئی تعلق نہیں، احادیث نبوی لکھی گئی ہوں یا نہ لکھی گئی ہوں، قرآن شریف بہر حال لکھا گیا اور ضرور لکھا گیا، یہ اور بات ہے کہ لکھنا بہت تھوڑے لوگوں کو آتا تھا، اس لیے قرآن کے بہت سے نسخے نہ رائج ہوئے ہوں گے لیکن یہ چیز بھی ہمارے موضوع بحث پر اثر انداز نہیں ہوتی، پھر جو شخص بھی قرآن لکھ لیتا وہ اس کو ایک قیمتی خزانہ ہی نہیں بلکہ کونین کی دولت اور دارین کی فلاح کا سرمایہ سمجھتا تھا۔

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ وہ متاع جو دنیاوی حیثیت سے ہی مرکز توجہ ہو سکتی ہو اسے تو انسان خاص حالات اور خاص صورتوں میں چھوڑ بھی سکتا ہے، ایک شخص بڑے چاؤ سے ایک محل تعمیر کراتا ہے، ممکن ہے کہ وہ اسے گراں قیمت پر علاحدہ بھی کر دے، اس کی تائید ان تمام خزانوں کی خرید و فروخت سے ہوتی ہے جو نوادر کہلاتے ہیں، بہتوں نے اپنے خاندانی نوادر امریکی نو دولتیوں کے حوالے کر دیے، اگر جان کا سوال آ جائے تو ایسی متاع کو جان کا صدقہ مال کہہ کر علاحدہ کیا جا سکتا ہے لیکن جس چیز سے خواہ وہ بظاہر کتنی ہی کم مایہ کیوں نہ معلوم ہوتی ہو، انسان کو عشق ہو، وہ اسے گراں سے گراں قیمت پر بھی علاحدہ کرنا پسند نہیں کرتا، اس پر جان عزیز تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے مگر اسے اپنے سے جدا نہیں کرتا اور جب پھر یہ عشق شغف کے درجہ کو پہنچ جائے اور وہ بھی والہانہ اور اس کے ساتھ مذہبی جذبہ بھی شامل ہو تو دنیا کی کوئی ترغیب یا ترہیب اسے علاحدہ کر دینے اور اس سے غفلت برتنے پر

آمادہ نہیں کر سکتی۔

صحابہ کرامؓ کا قرآن مجید کے ساتھ شغف عدیم المثال ہے، اس لیے یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ جو حصہ بھی قرآن کا لکھا ہوا ان میں سے کسی کے پاس رہا ہوگا اس کو اس نے ضائع یا اس پر کسی اور کی دسترس گوارا کی ہوگی۔

ایک چھوٹا سا واقعہ مکی دور کا اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے، حضرت عمرؓ اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام لانے کی خبر سن کر انتہائی غصہ کی حالت میں اپنی بہن کے یہاں پہنچتے ہیں اور مار پیٹ پر اتر آتے ہیں مگر جب وہ بہن سے لکھی ہوئی وہ چیز جسے وہ پڑھ رہی تھیں مانگتے ہیں تو بہن جواب دیتی ہیں تم اسے چھو نہیں سکتے، یہ پاک صحیفہ ہے۔

غور کیجیے اس ذرا سے واقعہ میں کتنی بڑی داستان، کتنی اہم روئیداد، اس والہانہ شوق، اس عشق اور اس شغف کی ہے جو مسلمانوں کو قرآن مجید کے ساتھ تھا۔

اس موقع پر یہ غیر متعلق نہ ہوگا اگر اس ارشاد نبوی کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ "بلغوا عنی ولو کان ایۃ" چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو جو مجھ سے تم کو ملے، اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

اس ارشاد نبویؐ کی جس طرح تعمیل کی گئی وہ اسلامی دعوت و تبلیغ کا ایک زریں باب ہے، یہاں اس کا اعادہ مقصود نہیں، صرف اتنا ہی ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کے ماتحت آپ کے اصحاب کو کلام مجید کا جو حصہ بھی پہنچتا اس کو وہ دوسروں تک پہنچا دیتے، جو بزرگ مدینہ سے باہر ہوتے، آتے ہی ان کو اس کی تلاش ہوتی کہ کون سی آیت اور کون سی سورہ ان کی عدم موجودگی میں نازل ہوئی ہے، اس کو معلوم کرتے اور یاد کر لیتے، اس سے یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ کلام مجید کا کوئی جز بھی ایسا نہیں تھا جو آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں متعدد اصحاب رسول اللہ کو زبانی یاد نہ ہو گیا ہو اور ان میں سے چند لوگوں نے اسے لکھ بھی نہ لیا ہو۔

حضرت زید بن ثابتؓ تو ہر وقت مدینہ میں موجود رہتے تھے اور خود رسول اکرم ﷺ ان کو کتابت وحی کے لیے طلب فرمالیا کرتے تھے، اگر چہ اس سے یہ لازم

نہیں آتا کہ ساری نازل شدہ آیتیں بلا استثنا ان کو لکھا دی گئی ہوں لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، فرض کیجیے کوئی سورہ یا آیت اس وقت نازل ہوئی جب زیدؓ مدینہ میں نہیں تھے، تو یقینی ہے کہ جب وہ مدینہ واپس آئے ہوں گے تو نازل شدہ آیت یا سورہ کا کھوج لگایا ہوگا اور معلوم کر کے اس کو لکھ لیا ہوگا، اس لیے یہ محض قیاس نہیں بلکہ یقینی نتیجہ ہے کہ زید بن ثابتؓ اور دوسرے بزرگ اپنے مصاحف کو بالکل اپٹوڈیٹ رکھتے تھے۔

یہ نتیجہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت بالاتفاق زید بن ثابتؓ کے پاس لکھا ہوا مکمل قرآن کا نسخہ موجود تھا، اس سلسلہ میں بخاری کی روایت جس میں "لم یجمع القران" کا ٹکڑا ہے، قابل توجہ ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی میں کبھی چند آیتیں نازل ہوتیں اور کبھی کبھی پوری پوری سورہ، جو سورتیں پوری کی پوری بیک وقت نازل ہوتیں ان کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔

مسند ابن حنبل کی روایت سے اشتباہ ہوتا ہے کہ آیت کی جگہ کبھی کبھی نزول کے کچھ عرصہ بعد متعین ہوتی تھی، اس کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں:

كنت جالسا عند رسول الله ﷺ اذ اشخص ببصره ثم صوبه حتى كادوان يبن قدمه بالارض ثم شخص ببصره......فاتاني جبرئيل	میں رسول اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک آپ کی نگاہیں اٹھیں، پھر اسے ٹھیک کرلیا، یہاں تک کہ آپ کی نگاہیں آپ کے پائے مبارک پر پڑنے لگیں، پھر آپ نے نگاہیں اٹھائیں اور حضرت جبرئیل تشریف لے آئے۔

اس میں نزول وحی کا ذکر نہیں ہے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آیت اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الخ جس سے یہ حدیث متعلق ہے پہلے نازل ہو چکی تھی، اس کے مقام کا تعین بعد میں ہوا۔

لیکن سیوطی نے اتقان میں ایک روایت یہ بھی لکھی ہے:

......(وقال) الكرماني في البرهان......	کرمانی برہان میں کہتے ہیں کہ آخری آیت
و كان اخرالأيات نزولاً وَاتَّقُوا يَوْمًا	نزول کے اعتبار سے وَاتَّقُوا يَوْمًا
تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللَّهِ فامره جبريل	تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللَّهِ تھی، حضرت جبرئیلؑ
ان يضعها بين أيتي الرباء والدين	نے اس کے متعلق فرمایا کہ اسے الربوا اور الدین کے وسط میں رکھا جائے۔

اس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس آیت کے نزول کے ساتھ ہی ساتھ اس کا مقام بھی متعین کر دیا گیا۔

ان دونوں میں سے کوئی صورت بھی اس امر سے متعارض نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ آیات کا مقام اور ان کی ترتیب سورتوں میں وحی کے ذریعہ مقرر فرماتے تھے اور اسی ترتیب سے کاتب وحی کو لکھاتے تھے۔

اس سے ہمارا دوسرا مقدمہ یعنی سورتوں کا تعین بھی خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا، ضمناً ثابت ہوتا ہے۔

اس مقدمہ کے ثبوت کے لیے خالی یہ ضمنی شہادت ہی ہمارے پاس نہیں ہے بلکہ اس کی براہ راست شہادت ان احادیث صحیحہ سے ملتی ہے جن میں آنحضرت ﷺ کی سورتوں کی تلاوت نام بہ نام مذکور ہے، شاہ معین الدین لکھتے ہیں:

> "حدیث کی کتابوں میں سورتوں کے فضائل اور نمازوں میں آنحضرت ﷺ کی ان کی تلاوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تقریباً تمام سورتوں کا ذکر آتا ہے، ان سب کی روایات کا نقل کرنا دشوار ہے، اس لیے صرف ان کے نام لکھ دیے جاتے ہیں، بخاری ومسلم میں حسب ذیل سورتوں کی تلاوتِ نبویؐ کا ذکر ہے۔"

اس کے بعد نام بہ نام دس سورتوں کا تذکرہ ہے، ابوداؤد میں اسی طرح بیس اور سورتوں کا تذکرہ ہے، ترمذی میں آٹھ مزید سورتوں کا تذکرہ ہے۔

ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کم از کم ان سورتوں کو

علیٰ حالہا مرتب فرمادیا تھا۔

اب ہم اس آخری مرحلہ کی طرف آتے ہیں جو ان میں سب سے زیادہ نازک، دقت طلب اور روایات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے مشکل نظر آتا ہے، اسی لیے اس مسئلہ پر ہمیشہ سے اختلاف رائے رہا ہے اور ہر دور میں صاحبانِ علم کے دو گروہ رہے ہیں، ایک کا خیال ہے کہ سورتوں کا نظم توقیفی ہے، دوسرا اس کے برعکس رائے رکھتا ہے، اس کے نزدیک سورتوں کے نظم کا کام آنحضرت ﷺ نے امت کے سپرد فرمادیا تھا، اس لیے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا سورتوں کا باہمی نظم خود حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا یا نہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مقدمہ پر غور کرنے کی ابتدا زید بن ثابتؓ کی ایک مشہور روایت سے کی جائے جو بخاری میں ہے، اس کے متعلقہ الفاظ حسب ذیل ہیں:

ان زید بن ثابتؓ قال ارسل الی	زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ
ابوبکر الصدیق مقتل اھل الیمامۃ فاذا	نے مجھے طلب فرمایا، اس وقت جنگ یمامہ
عمربن الخطاب عندہ فقال ابوبکر	ہورہی تھی، حضرت عمر بن الخطابؓ بھی آپ
ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر	کے پاس موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا
یوم الیمامۃ بقراء القران وانی اخشی	کہ عمر میرے پاس آئے اور یہ کہہ رہے ہیں
ان استحر القتل بالقراء فی المواطن	کہ جنگ یمامہ قرا کے لیے بہت شدید
فیذھب کثیر من القران وانی اری ان	ثابت ہورہی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ زیادہ
تأمر بجمع القران فقلت لعمر کیف	قرا کا قتل ہوجائے اور بہت سے حفاظ ختم
نفعل شیئًا لم یفعلہ رسول اللّٰہ	ہوجائیں گے، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ
ﷺ قال لعمر ھو واللّٰہ خیر فلم یزل	آپ قرآن کے جمع کا حکم دیجیے، میں نے
یراجعنی حتی شرح اللّٰہ صدری	عمرؓ سے کہا کہ میں ایسا کام کیسے کروں جس کو
لذلک ورأیت فی ذلک الذی رای	رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، عمرؓ نے کہا بخدا
عمرؓ، قال زید، قال ابوبکر! انک	یہ خیر کا معاملہ ہے اور وہ برابر مجھ سے اصرار
رجل شاب وعاقل لانتھمک وقد	کرتے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس

كنت تكتب الوحي لرسول الله ﷺ فتتبع القران اجمعه فوالله لو كلفوني نقل جبل من الجبال ما كان اثقل علي مما امرني به من جمع القران، قلت كيف تفعلان شيئا لم يفعله رسول الله ﷺ قال هو والله خير، فلم يزل ابوبكرؓ يراجعني حتى شرح الله صدري للذي شرح الله صدري ابي بكرؓ و عمرؓ فتتبعت القران اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال ووجدت أخر سورة التوبة مع ابي خزيمة الانصاري لم اجدها مع غيره "لقد جاء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ماعنتم حريص عليكم" حتى خاتمة البراة، فكانت الصحف عند ابي بكر حتى توفاه الله ثم عند عمر حياته ثم عند حفصةؓ بنت عمرؓ

کے متعلق شرح صدر کر دیا اور میری بھی اس بارہ میں وہی رائے ہوگئی جو عمر کی ہے، زیدؓ نے کہا کہ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم عاقل اور نوجوان شخص ہو، تم پر کوئی اتہام بھی نہیں ہے اور تم وحی بھی لکھا کرتے تھے اس لیے قرآن کو تلاش اور اس کو جمع کرو، زید کہتے ہیں کہ بخدا اگر مجھے پہاڑ کا بوجھ اٹھانے کے لیے بھی کہتے تو قرآن کریم کو جمع کرنے کے مقابلہ میں وہ ہلکا کام ہوتا، میں نے کہا تم لوگ اس کام کو کیسے کرتے ہو جس کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، انہوں نے کہا کہ بخدا اس میں بہتری ہے، حضرت ابوبکرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ اس ذات نے میرا بھی سینہ اس بات کے لیے کھول دیا جس کے لیے ابوبکر و عمر کا شرح صدر کیا تھا، چنانچہ میں نے تمام قرآن کو عسیب اور لخاف اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ آخری سورۂ توبہ کو ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس پایا، اس کے علاوہ اور کسی کے پاس مجھے وہ سورہ نہیں ملی، "لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم" سے لے کر برأت کے خاتمہ تک یہ صحیفہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا،

یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی، پھر حضرت عمرؓ کے پاس ان کی زندگی تک رہا، پھر حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس رہا۔

اس روایت کے جو خاص الفاظ قابل توجہ ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے:

انی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القران	مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح لڑائیوں میں قرا قتل ہوتے رہے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا۔

۲۔ حضرت ابوبکرؓ کا قول:

فتتبع القرآن فاجمعه	قرآن کو تلاش کر کے اسے جمع کرو۔

۳۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا قول:

فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال...... فكانت المصحف عند ابی بکرؓ	تو قرآن کی تلاش شروع اور اس کو عسیب، لخاف اور لوگوں کے سینوں سے جمع کیا، یہ مصحف حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا۔

اس روایت کے سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں، حافظ ابن حجر اس روایت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وقتل فی غصون ذلك من الصحابة كثيرة قيل سبع مائة وقيل اكثر	اس لڑائی کے دوران میں بہت سے صحابہ قتل ہوئے، کہا جاتا ہے کہ سات سو یا اس سے زیادہ۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

ووقع من تسمية القراء الذين اراد عمر في رواية سفيان بن عيينة المذكورة قبل سالم مولىٰ ابی حذیفة ولفظه فلما قتل سالم مولىٰ ابی حذیفة خشی	سفیان بن عیینہ کی روایت میں حضرت عمرؓ نے سالم مولیٰ ابوحذیفہ کے قتل سے پہلے جن مقتول قرا کی طرف اشارہ کیا تھا ان کا نام مذکور نہیں ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ

عمر ان یذھب القران فجاء الی ابی بکرؓ وسیاتی ان سالماً احمد من امر النبیؐ باخذ القران عنہ (فتح الباری، ج۹،ص۹)

جب سالمؓ مولیٰ ابوحذیفہ قتل ہو گئے تو عمرؓ کو قرآن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا، اس وقت وہ ابوبکرؓ کے پاس آئے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، سالمؓ ان صحابہ میں سے ایک تھے جن سے رسول اللہ ﷺ نے قرآن حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس کے بعد فیذھب کثیر من القران کی تشریح میں لکھتے ہیں:

فی روایۃ یعقوب......من الزیادۃ الا ان یجمعوہ وفی روایۃ شعیب قبل ان یقتل الباقون"

یعقوب کی روایت میں الا ان یجمعوہ کا فقرہ اور شعیب کی روایت میں قبل ان یقتل الباقون کا فقرہ زیادہ ہے۔

اس وضاحت وتشریح کے بعد ایک چھوٹے سے جزئیہ پر ذہن صاف کر لیجیے، یمامہ کی جنگ میں کوئی سات سو یا اس سے زیادہ صحابہ کرام شہید ہوئے، سفیان کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کو ذھاب قران کا جو خدشہ ہوا وہ زیادہ تر سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ کی شہادت کی وجہ سے ہوا، اس لیے کہ سالمؓ ان چند ہستیوں میں سے ایک تھے جن سے نبی اکرم ﷺ نے ''اخذ قرآن'' کی اجازت دی تھی، اس لیے شعیب کی روایت کے مطابق قرآن کو جمع کر لینا ضروری تھا قبل اس کے کہ باقون کا بھی وہی حال ہو جو سالم کا ہوا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جمع کرنے کا سب سے بڑا سبب حضرت سالمؓ کی شہادت تھی، کیوں کہ وہ ان صحابہ میں تھے جن کو قرآن پڑھانے کی اجازت آنحضرت ﷺ نے مرحمت فرمائی تھی، شعیب کی روایت اس کا مزید ثبوت ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، ہر مسلمان کو خواہ وہ کسی درجے کا ہو، قرآن کا کوئی نہ کوئی جز ضرور یاد ہوتا تھا، نماز تلاوت قرآن کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی تھی اور وہ بھی دن میں پانچ نمازیں، اس لیے ہر مسلمان کی یادداشت میں کتنا ہی چھوٹا حصہ سہی، قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور محفوظ رہتا تھا، صحابہ کرامؓ میں تو بہت سے ایسے تھے جن کو پورا قرآن یاد تھا اور دنیا

کی کوئی چیز ان کے اس عزم وارادہ میں حائل نہ ہوتی تھی ،اگر وہ دن میں ''فرستان'' ہوتے تھے تو راتوں میں رہبان ،شب زندہ دار اور تمام اشغال واذکار میں تلاوتِ قرآن سب سے افضل اور بالاتر ذکر تھا اور وہ بھی ایسی قوم کے افراد جو غیر معمولی حافظہ کی مالک تھیں ،اس لیے یہ یقین ہے کہ ان سات سو بزرگوں میں جنھوں نے یمامہ میں جام شہادت نوش کیا ، بہت سے ایسے خوش نصیب رہے ہوں گے جنہیں پورا قرآن یاد تھا ،ان سے زیادہ تعداد ان حضرات کی ہوگی جو بقید حیات اور پورے قرآن کے حافظ تھے ،حضرت عمرؓ کو ۶۹۹ حضرات کی شہادت سے ''ذھاب قران'' کا اتنا اندیشہ نہیں ہوا جتنا اس ہستی کی شہادت سے ہوا جسے نبی اکرم ﷺ نے تعلیم قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی تھی ،اسی صفت سے وہ بزرگ بھی متصف تھے جن کی طرف شعیب نے اپنی روایت میں ''باقون'' کے لفظ سے اشارہ کیا ہے ،اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگ یمامہ کے بعد بھی حفاظ قرآن صحابہ کی کافی تعداد باقی رہ گئی تھی ۔

اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس کتاب کے ساتھ لوگوں کو ایسا شغف ہو جیسا کہ اصحاب رسول اللہ کو قرآن کے ساتھ تھا اور جس کو حفظ کرنا سعادت دارین سمجھا جاتا رہا ہو تو یہ عقلاً ناممکن ہے کہ اس کے دائرہ کو کوئی بڑی سے بڑی آفت مٹا سکتی تھی ،حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ جیسے فطین وفریس بزرگوں پر یہ تہمت ہرگز نہیں لگائی جاسکتی کہ ایسی کھلی ہوئی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور انہیں یہ گمان ہوا کہ اگر اسی طرح اور لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی شہادت ہوتی رہی تو ایک دن وہ آسکتا ہے جب پورے قرآن کا حافظ روئے زمین پر نہ رہ جائے اور کثیر من القران ضائع ہو جائے ۔

اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ''ذھاب القران'' کا خدشہ اس وجہ سے تھا کہ اگر سالمؓ کی طرح اور جو باقی حضرات ایسے تھے جنہیں آنحضرت ﷺ نے تعلیم قرآن کی اجازت عطا فرمائی تھی وہ اگر جہادوں میں واصل بحق ہو گئے تو قرآن پڑھانے والا کوئی نہ رہ جائے گا اور جو نسخے ان بزرگوں کے پاس ہیں ممکن ہے کہ وہ بھی ضائع ہو جائیں ،اس لیے کہ وہ نسخے ذاتی اور شخصی ملکیت کے تھے اور ان کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری شخصی اور انفرادی تھی پوری قوم یا سلطنت کی نہ تھی ۔

صرف ایک طریقہ سے اس خطرہ کو دور کیا جا سکتا تھا، وہ یہ تھا کہ ان بزرگوں کے تعاون سے کلام مجید کا ایک مستند نسخہ تیار کرا کے خلافت کی حفاظت میں لے لیا جائے۔

استیعاب (۱) میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمرؓ سے کسی نے کہا کہ ایک شخص کوفہ میں حافظہ سے قرآن پڑھاتا ہے، یہ سن کر آپ غضب ناک ہو گئے، مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں تو آپ خاموش ہو گئے، اس روایت کے دو پہلو قابل توجہ ہیں:

پہلا رخ تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ یاد سے پڑھانے والے پر غضب ناک ہوئے یعنی آپ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ قرآن کو بغیر دیکھے ہوئے پڑھائیں۔

اب ذرا ذہن کو پیچھے کی طرف لے جائیے اور یاد کیجیے کہ عہد نبویؐ میں قرآن پڑھانے والے مختلف قبیلوں اور قریوں میں بھیجے جاتے تھے، اس لیے یہ قیاس غالب ہے کہ ان بزرگوں کے پاس کلام مجید کا لکھا ہوا حصہ ہوتا تھا جس کو دیکھ کر وہ کلام مجید کا درس دیتے تھے، اگر بلا دیکھے ہوئے درس دینے کا رواج آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ہوتا تو حضرت عمرؓ اس پر غضب ناک نہیں ہو سکتے تھے۔

دوسرا پہلو اس روایت کا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا کہ زبانی درس دینے والے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں تو آپ خاموش ہو گئے، اس لیے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ان چند نفوس قدسیہ میں تھے جن کو آنحضرت ﷺ نے تعلیم قرآن کی اجازت دی تھی۔

اس سے یہ نتیجہ صاف نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے کہ قرآن کا درس زبانی صرف وہی حضرات دیں جن کو آنحضرتؐ نے درسِ قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی ہو، بقیہ حضرات لکھے ہوئے قرآن کو دیکھ کر پڑھائیں۔

اس پس منظر میں حضرت عمرؓ کے خدشہ پر غور فرمایئے تو جو بات میں نے اوپر عرض کی ہے اس کی مزید تائید ملے گی، ایسے بزرگ جنہیں حافظہ سے قرآن پڑھانے کی اجازت ہو حضرت عمرؓ کے نزدیک وہی ہو سکتے تھے جن کو خود سرکار دو عالم ﷺ نے اجازت دی ہو اور ایسے نفوس قدسیہ بہت تھوڑے تھے، ان میں سے ایک جنگ یمامہ میں کام آ چکے تھے، بقیہ بھی اگر

---

(۱) استیعاب، ج ۱، ص ۳۷۰ بحوالہ تاریخ القرآن عبداللطیف رحمانی۔

اسی طرح سدھار جاتے تو پھر حضرت عمرؓ کے نقطہ نظر سے کوئی ایسا شخص باقی نہ رہ جاتا جو اس فریضہ کو انجام دے سکے، ان کے بعد وہی لوگ رہ جاتے جو لکھے ہوئے قرآن کو دیکھ کر پڑھا سکیں۔

اب سوال یہ تھا کہ اس مقصد کے لیے قرآن کے مکتوبہ نسخے کو لوگوں کی ذاتی کوششوں پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس شخص سے چاہیں اور قرآن کا جو جزو چاہیں لکھ لیں اور جس طرح چاہے لکھ لیں اور اس کے ذریعہ درس وتدریس شروع کر دیں، اس کا جو نتیجہ ہوتا اس کے لیے کسی باریک بینی کی ضرورت نہیں، ایک نہیں ہزاروں کلام پاک کے نسخے تیار ہو جاتے، کوئی مالك يوم الدين لکھتا، کوئی ملك يوم الدين، کوئی مليك يوم الدين وقس علىٰ هذا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا طرز تحریر اور رسم الخط ہی کا اختلاف فتنہ کا سبب بن جاتا۔

اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس وقت بھی کلام مجید میں کچھ ایسے الفاظ ہیں جو خلاف قیاس (رواج) لکھے گئے مگر جس طرح بھی لکھے گئے آج تک اسی طرح قائم ہیں کیوں کہ ان کی سند صحابہ رضوان اللہ تک پہنچتی ہے۔

اب انہیں کسی قیمت پر اور کسی آسانی کی خاطر بھی بدلا نہیں جا سکتا اور نہ بدلنا چاہیے، یہ حزم واحتیاط جو مسلمانوں نے کتاب اللہ کے متعلق برتی ہے، سوائے اس صحیفۂ خداوندی کے کسی اور صحیفہ کے ساتھ نہیں برتی گئی، یہاں تک کہ حدیث جو کلام اللہ کے معاً بعد آتی ہے، اس میں بھی یہ احتیاط نہیں ہے اور یہ احتیاط شروع ہی سے کلام مجید کے متعلق ملحوظ رکھی گئی ہے۔

غرض ۱۲ھ کی جنگ یمامہ کے بعد حالات حسب ذیل ہیں:

کچھ حضرات کے پاس ان کے ذاتی لکھے ہوئے کلام مجید کے نسخے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی مستند نسخہ نہیں تھا، بہت سے حضرات لکھے ہوئے مصاحف سے قرآن کا درس دیتے تھے اور قرآنی درس کی ضرورت اسلام کا دائرہ بڑھنے کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی، اس لیے اغلب گمان یہ ہے کہ جیسے اور جہاں سے بھی بن پڑتا ہوگا لوگ کلام مجید کی نقلیں حاصل کر لیتے ہوں گے اور اپنے طریقہ (رسم الخط) سے لکھ لیتے ہوں گے۔

ان حالات میں اگر معمولی فہم وفراست کے انسان کے سامنے بھی یہ مقصود ہو کہ ایک کتاب کے جو نسخے بھی تیار ہوں وہ بعینہٖ وبجنسہٖ حتیٰ کہ رسم الخط میں بھی ایک جیسے ہوں تو

وہ کون سی راہ عمل اختیار کرے گا، اس لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے یعنی ایک مستند نسخہ اس کتاب کو تیار کر کے اسے رائج کرنا۔

ایک اور روایت بھی اس سلسلے میں پیش نظر رہے تو مفید ہوگی، کنز العمال میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ صحتِ تلفظ کا بھی بڑا اہتمام کیا تھا اور ہر جگہ تاکیدی حکم بھیج دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ صحتِ اعراب کی تعلیم بھی دی جائے اور یہ بھی حکم تھا کہ جو شخص علم لغت کا ماہر نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے۔(۱)

یہ ذہنیت بھی بلا واسطہ اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا تذکرہ ایک پیراگراف میں پہلے کیا گیا ہے اور اس کا پھر اعادہ کیا جاتا ہے، وہ راہ عمل یہ تھی کہ قرآن کا ایک مستند نسخہ تیار کرالیا جائے اور اسے رائج کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مستند نسخہ حکومت کی نگرانی ہی میں تیار ہوسکتا تھا اور حکومت ہی کے قبضہ وحفاظت میں رہ سکتا تھا تاکہ اس سے بوقت ضرورت استفادہ کیا جاسکے۔

دوسرا ٹکڑا جو نظر میں رکھنا ضروری ہے وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کی ہدایت ہے کہ قرآن کا تتبع کرو اور فاجمعه سے جمع کرو، اس کے بعد حضرت زیدؓ کا بیان ہے کہ میں نے تتبع کیا اور قرآن کو عسب، لخاف اور صدور رجال سے جمع کیا۔

اس میں خاص لفظ ''جمع'' کا ہے، جس کے لغوی معنی ضم اور تالیف کے ہیں، عبداللطیف اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جمع سے مراد کتابت ہے اس لیے کہ یہ ضم اور تالیف کے ہم معنی ہیں (تاریخ القرآن، ص ۴۸) ممکن ہے اس رائے سے کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ جمع کے معنی اکٹھا اور یکجا کردینے کے ہیں، حضرت ابوبکرؓ صدیق فرماتے ہیں کہ قرآن کو جمع کردو، اکٹھا یا یکجا کردو، اس سے بادی النظر میں خیال ہوسکتا ہے جیسا کہ اکثر حضرات کو ہوا ہے کہ قرآن مرتب ومنضبط نہ تھا بلکہ منتشر اور پراگندہ تھا اس لیے اسے حضرت ابوبکرؓ صدیق نے جمع کرنے کا حکم دیا لیکن محتاط لوگ اور مسلمان محققین عموماً اس قول کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ قرآن تو مکمل تھا اور جہاں تک سورتوں کا تعلق ہے مربوط اور منضبط

(۱) اسوۂ صحابہ، ج ۲، ص ۲۲۹، ۱۹۵۵ء ایڈیشن۔

بھی تھا لیکن کسی ایک جگہ لکھا ہوا بین الدفتین نہ تھا۔

اتقان میں سیوطی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

(قال) الخطابی انما لم یجمع صلی اللّٰہ علیہ وسلم القران فی المصحف ......وقد کان القران کتب کلہ فی عہد رسول اللّٰہ لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور	صرف نبی کریمؐ نے قرآن کو مصحف کی شکل میں جمع نہیں کیا تھا ...... قرآن کل کا کل رسول اکرمؐ کے عہد میں لکھا تو جا چکا تھا لیکن یکجا نہیں تھا اور سورتیں مرتب نہ تھیں۔

(الاتقان، مطبوع مصر، ج ۱، ۵۸، ۵۹)

آگے چل کر صفحہ ۶۰ کی حسب ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے:

(وقال) الحارث المحاسبی فی کتاب فہم السنن کتابۃ القران لیست بمحدثۃ، فانہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یامر بکتابۃ ولکنہ کان مفرقا فی الرقاع والاکتاف والعسب فانما امر الصدیق بنسخہا من مکان الیٰ مکان مجتمعا وکان ذلک بمنزلۃ اوراق وجدت فی بیت رسول اللّٰہ ﷺ فیہا القران منتشرفجمعہا جامع وربطہا بخیط حتی لا یضیع منہا شیئ	حارث محاسبی فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی کتابت کوئی جدید بات نہیں تھی اس لیے کہ نبی کریمؐ نے اس کے لکھنے کا حکم دیا تھا لیکن وہ رقاع واکتاف اور عسیب میں متفرق ومنتشر طور پر لکھا ہوا تھا، ابوبکر صدیقؓ نے اسے مرتب طریقے سے یکجا لکھنے کا حکم دیا اور یہ بمنزلہ ان اوراق کے تھا جو رسول کریم ﷺ کے گھر میں پائے گئے تھے، ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا، اسی کو جامع نے جمع کرادیا اور ایک تاگے میں اس طرح پرو دیا کہ اس میں سے کوئی بھی حصہ ضائع نہیں ہوا۔

غالباً اسی سے متاثر ہو کر اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے قرآن لکھ رکھا تھا ان کے قرآن کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی کھجور کے پتوں پر لکھا ہوا ہے، کوئی پتھروں اور ٹھیکروں پر، کوئی لکڑی کی

تختیوں پر، کوئی رقاع (چمڑے) پر، کوئی اونٹ کی پسلیوں پر، الغرض کوئی ایسی اطمینانی حالت نہ تھی کہ اس کے بہت دن تک محفوظ رہنے کی امید ہو۔"

"سب سے پہلے یہ خیال حضرت عمرؓ کو پیدا ہوا کہ قرآن کو ایک شیرازہ میں ہوجانا چاہیے اور یہ خیال اس وقت پیدا ہوا جب کہ جنگ یمامہ میں جو آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد ہی ہوئی تھی، بارہ سو قرا اور حفاظ قرآن میں سے سات سو مقتول ہوگئے، انہوں نے سوچا کہ جن لوگوں کے پاس قرآن ہے یا وہ لوگ جو اس کے حافظ و قاری ہیں، اگر اسی طرح ان کا خاتمہ ہوگیا تو قرآن ضائع ہوجائے گا۔" (تاریخ القرآن، اسلم)

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے اس امر کے یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اس زمانے میں بہت سے قرا اور حفاظ تھے، ان کے علاوہ انصار میں کم از کم چار بزرگوں کے پاس لکھا ہوا پورا قرآن موجود تھا، اس لیے مجھے اس بدگمانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ قرآن صرف پراگندہ طریقوں پر پتوں، لکڑیوں کی تختیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا اور ایسی کوئی اطمینانی حالت نہ تھی کہ اس کے بہت دنوں تک محفوظ رہنے کی امید ہو۔

یہ مانا کہ لکھا ہوا قرآن سب کا سب کاغذ پر لکھا ہوا نہیں تھا، فرض کر لیجیے کہ زید بن ثابتؓ کا قرآن صرف رقاع یا اونٹ کی پسلیوں ہی پر لکھا ہوا تھا، حالاں کہ ایسا فرض کر لینے کی کوئی معقول دلیل نہیں، پھر بھی اتمام حجت کے لیے اس کو مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ سب لکھا ہوا مرتب تھا یا نہیں یعنی یہ رقاع، اونٹ کی پسلیاں کسی ایک ترتیب سے تھیں یا یونہی بے ترتیب تھیں اور کیا یہی حال بقیہ اور حضرات کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا تھا۔

اگر تھا تو یہ جو روایت ملتی ہے کہ زیدؓ کا مصحف ابن مسعودؓ کے مصحف سے ترتیب میں مختلف تھا، یہ کیسے متعین ہوسکا۔

اس روایت سے سرسری طور پر نہ گزر جایئے، میرے خیال میں یہ بڑی اہم روایت ہے، اتقان صفحہ ۶۵ پر آخری سطر میں قال ابن اشتہ سے جو روایت شروع ہوتی ہے اس میں مصاحف ابن ابی کعب اور عبداللہ بن مسعودؓ کی سورتوں کے نام بہ نام ترتیب دی ہوئی ہے،

مثلاً تالیف مصحف ابی الحمد ثم البقر، ثم النساء، ثم ال عمران۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کی ترتیب سور بھی دی ہے، اس میں خاص لفظ جس پر دھیان رکھنا ہے وہ ثم کا ہے یعنی ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ، اسی طرح پورا مصحف مرتب و منظم تھا، اس روایت کے ماننے والوں پر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ ترتیب سوران دونوں ترتیبوں سے مختلف ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ ترتیب مصاحف جوان بزرگوں نے کی ، وہ کس وقت کی ، حضرت زیدؓ کی ترتیب کے بعد یا پہلے۔

اگر یہ ترتیب پہلے تھی تو پھر اس نظریہ سے انکار ناممکن ہے کہ کم از کم ان دو حضرات کے پاس کلام مجید مرتب تھا، یعنی قرآن کی سورتیں ایک خاص نظم کے ساتھ تھیں، ایسا نہیں تھا کہ قرآن مجید غیر مرتب تھا یعنی سورتوں میں باہم ترتیب نہ تھی۔

دوسری بات ان روایتوں کے متعلق یہ بھی ثابت ہے کہ ان حضرات کو اپنی ترتیب پر اصرار بھی تھا، یہ دونوں حضرات یہ سمجھتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ ان کی ترتیب ہی صحیح ترتیب ہے اور اس سے الگ دوسری ترتیب ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔

ایسا کیوں تھا ؟ کیا یہ حضرات سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنی رائے سے جو ترتیب دی ہے وہ ایسی ہی ہے کہ اب اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ، کیا ان کو اپنی رائے پر محض اس وجہ سے اصرار تھا کہ انہوں نے چوں کہ خود اپنے اجتہاد سے ایک نظم اور ایک ترتیب قائم کی ہے، اس لیے اب کسی دوسرے کو اس ترتیب کے خلاف سورتوں کے ترتیب دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس ''اجتہاد ذاتی'' پر آخر اس قدر شدت سے اصرار کی وجہ کیا تھی ، بظاہر اس کے خلاف اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ ان کو یقین تھا کہ یہی ترتیب خود ذات گرامیؐ نے فرمائی تھی ، اگر یہ ترتیب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نہیں تھی بلکہ خود مجتہد کا اپنا اجتہاد تھا تو کسی مخصوص ترتیب کی کوئی وجہ کیوں بیان نہیں ہوئی ، یہ ظاہر ہے کہ یہ ترتیب زمانہ نزول کے لحاظ سے نہیں ہے، پھر اگر ترتیب میں اجتہاد ہوسکتا ہے تو ربطِ مضمون کے لحاظ سے ہوسکتا ہے

مگر اس کا بھی کوئی تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔

ساتھ ہی ساتھ اس امر کو بھی سامنے رکھیے کہ حضرت ابوبکرؓ سے تالیف قرآن کے لیے کہا گیا تو آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں وہ کام کیسے کروں جو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا، کیا حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی ذہنیت اس سے مختلف تھی، کوئی معقول وجہ اس مفروضہ کی نظر نہیں آتی۔

اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے مصاحف کی جو ترتیب تھی وہ ان کے یقین کے مطابق وہی تھی جو خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔

اگر یہ ترتیب حضرت زیدؓ کے جمعِ قرآن کے بعد ہوتی تو یہ نقطۂ نظر اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے یقین کے مطابق زیدؓ کی ترتیب ترتیب نبویؐ سے مختلف تھی اس لیے انہوں نے زیدؓ کی ترتیب کو نہیں مانا بلکہ اس ترتیب پر مصر رہے جو ان کے علم و یقین کے مطابق خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔

غرض دونوں صورتوں میں یہ بات پایۂ یقین کو پہنچتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورتوں کی بھی ترتیب فرما دی تھی اور قرآن اپنی تمام وکمال سورتوں کے ساتھ ایک مرتب اور منظم حالت میں وصالِ نبویؐ کے وقت موجود تھا، اسے اور واضح طور پر سمجھنے کے لیے ایک دوسرے پہلو سے غور فرمائیے، فرض کیجیے کہ قرآن کی آخری دس سورتیں اونٹ کی پسلیوں پر ایک ایک کر کے لکھی ہوئی تھیں، ان سورتوں کو اب آج تک موسوم کر لیجیے، ان پسلیوں پر ۱۰ تک ہندسے ڈال لیجیے، اگر یہ پسلیاں ایک صحیفہ کا جزو ہیں تو لازم ہے کہ یہ پسلیاں ایک سے دس تک مرتب ہوں یعنی سورتیں الف سے ی تک ابجد ہوز کے ربط سے مرتب اور متعین ہوں، اگر ایسا نہیں ہے تو ہر مرتبہ جب آپ اپنے اس مجموعہ سے قرآن پڑھنا شروع کریں گے، مثلاً تراویح کے موقع پر، تو ہر مرتبہ ایک نئی شکل اور نئی ترتیب قرآن کی نظر آئے گی اور ان ترتیبوں کے امکانات قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں جیسا کہ آگے آئے گا لاکھوں تک پہنچیں گی۔

اس لیے جب تک یہ پسلیاں ایک نظام کے ماتحت مربوط نہ کر دی جائیں اس وقت تک ناممکن ہے کہ آپ ان سے ایک مصحف کے قسم کی کوئی چیز تیار کر سکیں، مصحف کا نام

ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس چیز پر کلام مجید لکھا ہوا تھا وہ سب ایک نظم میں مربوط اور منسلک تھا، اس لیے لوگوں کو یہ کہنے میں تکلف نہ ہوا کہ زید رضی اللہ عنہ کا مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف سے مختلف تھا۔

اگرچہ میں خود اس روایت کو ماننے کے لیے تیار نہیں جیسا کہ بعد میں عرض کیا جائے گا لیکن ان روایات سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ یمامہ کی جنگ کے پہلے بھی کچھ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس قرآن کے مرتب مصاحف موجود تھے، ان میں سورتیں بھی منضبط طریقہ پر تھیں۔

دوسری واضح بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر احتیاط فرماتے تھے کہ نزولِ وحی کے فوراً بعد کسی کاتب کو بلا کر نازل شدہ آیات کو لکھا دیتے، پھر اس کو پڑھوا کر سنتے، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے "فان کان فیه سقط اقامه" اگر کوئی چیز لکھنے سے چھوٹ جاتی تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درست کراتے، "ثم اخرجه الی الناس" اس کے بعد اشاعت کا عام حکم دیتے (۱) کیا ایسے حزم واحتیاط کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو گوارا فرما سکتے تھے کہ جو لکھا گیا ہے اور جس کی عام اشاعت ہو چکی ہے اس کو غیر منظم اور غیر مربوط حالت میں چھوڑ دیا جائے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ وحی کو محفوظ کرنے کا شدید جذبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تھا، اس کی حفاظت کا وعدہ تو خود ذات باری نے کیا تھا مگر اس کی تعمیل آپ کو کرنی تھی ورنہ وحی لکھانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، امت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہدایت نامہ اور ایک مشعل زندگی آپ کو چھوڑنا تھی، عرضۂ آخیرہ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آخری مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا جس کے کوئی چھ مہینہ بعد حضور کا وصال ہوا، اس وقت حدیث فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطابق آپ کو "حضرا اجل" یعنی قرب وصال کا خیال ہو گیا تھا، اس چھ مہینہ کی مدت میں بھی آپ نے کوئی ضرورت اس امر کی محسوس نہ فرمائی کہ یہ دیکھ لیں کہ جو خداوندی کتاب آپ امت کے لیے چھوڑ رہے تھے وہ ایک منضبط اور مربوط طریقہ پر مرتب ہو چکی ہے یا نہیں اور اس کو ایسی حالت میں چھوڑ جائیں کہ بعد کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ "ہاں

(۱) مجمع الزوائد بحوالہ تدوین قرآن، ص ۲۸۔

قرآن تو تھا لکھا ہوا ضرور مگر ایسی اطمینانی حالت اس کی نہ تھی کہ اس سے امید کی جائے کہ ایک مدت کے لیے باقی اور محفوظ رہ سکے گا، اگر اس کو ایک شیرازہ میں جمع کر کے تاگے میں سی دیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ رہ جائے گا، ایک معمولی سوجھ بوجھ کے انسان سے بھی ایسی فروگزاشت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

تدوین قرآن میں غلام ربانی لکھتے ہیں:

''جو کتاب قرآن کی طرح تدریجی طور پر مکمل ہو رہی ہو اس کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہوگا بلکہ قرآنی سورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنھیں مصنّفین اپنے پیش نظر تصانیف کے لیے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے آتے ہیں۔''

اس کی تائید میں ازالۃ الخفا سے حضرت شاہ ولی اللہ کا حسب ذیل مقولہ پیش کرتے ہیں: ''مثل آں کہ منشی منشآت خود را یا شاعر قصائد و قطعات خود را بیاضہا و سفینہا مندرج سازد۔''

ان کی رائے میں قرآن کچھ اس طرح مرتب ہوتا تھا کہ فرض کر لیجیے کہ سورہ ''الف'' کی دو آیتیں آج نازل ہوئیں، وہ پہلے اونٹ کی پسلی نمبر ا پر لکھ لی گئیں، دوسرے دن سورہ ''ب'' کی دو آیتیں نازل ہوئیں وہ پسلی نمبر ۲ پر لکھ لی گئیں، تیسرے دن سورہ ''الف'' کی دو اور آیتیں نازل ہوئیں، وہ پسلی نمبر ۳ پر لکھ لی گئیں، چوتھے دن بعد سورہ ''ج'' کی کچھ آیتیں نازل ہوئیں وہ پسلی نمبر ۴ پر لکھ لی گئیں اور پھر کاتبان وحی جن کی تعداد ۴۲ بتائی جاتی ہے وہ ''حول النبی'' جمع ہوئے اور ''تولف القران فی الرقاع'' کا کام یوں شروع ہوا کہ ان سب پسلیوں کو دیکھا اور جو آیت جس سورہ کی تھی اسے وہاں لکھ لیا، اس طرح ایک مصحف تیار ہو گیا جو ''رقاع'' چرمی قطعات پر لکھا جاتا تھا، مجھے اس رائے کے بلا کم و کاست ماننے میں تامل ہے:

اولاً یہ کہ تالیف قرآن اور ''منشآت''، ''قصائد'' و ''قطعات'' کو بیاض میں لکھنے اور

پھر اس سے مضمون یا قصیدہ ترتیب دینے میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر یعنی تالیف قرآن میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں ہوسکتی تھی، صرف آیتوں کی جگہ میں تبدیلی ہوسکتی تھی، اس کو یوں سمجھیے کہ بلاتشبیہ اقرا کی پانچ آیتیں جو پہلے اتریں وہ لکھ لی گئیں، چھٹی آیت جب نازل ہوگی تو لکھ لی جائے گی، ممکن ہے کہ اس کی جگہ چار نمبر قرار پائے، اس طرح پہلے کی پانچویں آیت بعد میں چھٹی آیت ہو جائے، یہ تو ممکن ہے، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ میں کوئی تبدیلی واقع ہو سکے اور نعوذ باللہ اس کی جگہ اِقْرَاْ بِاسْمِ اللّٰه العظیم لکھا جا سکے۔

جو لوگ قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک تو تالیف قرآن میں اس پہلو سے کوئی دقت نظر نہیں آئی، ہاں نسخ ماننے والوں کے لیے یہ بڑا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر آیت ہی بعد میں بدل گئی تو ایک دقت اور پیش آئے گی۔

لیکن ان دونوں میں سے کوئی صورت بھی مان لیجیے، نفس مسئلہ میں اس سے کوئی خاص الجھن نہیں پیدا ہوتی، تالیف قرآن کی تاریخی روداد یہ ہے فرض کر لیجیے کہ سورۂ بقرہ کی کچھ آیتیں ایک دن اتریں، رسول اکرم ﷺ نے کسی کاتب وحی، مان لیجیے زید بن ثابتؓ کو وہ آیتیں لکھا دیں اور اس کو پڑھوا کر سن لیا اور اس کے بعد اس کی نقل دوسرے صحابہ نے بھی کر لی پھر کچھ اور آیتیں اتریں، کچھ سورۂ بقرہ کی اور کچھ آل عمران کی، آنحضرت ﷺ نے ان کو بھی ان کا مقام متعین کر کے لکھوا دیا، ان کو پڑھوا کر اور سن کر ان کی اشاعت کی اجازت دے دی، اب آپ غور کیجیے کہ اوپر والی مثال میں جو محض فرضی اور قیاسی ہے، جب سورۂ بقرہ کی گیارہویں آیت لکھی گئی تو آنحضرت ﷺ نے اسے سنا، سوال یہ ہے کہ کیا صرف اسی ایک آیت کو سنایا، اس کے پہلے جو دس آیتیں تھیں، ان سب کو یا کم سے کم وہ آیت جو گیارہویں آیت کے متصلاً واقع ہے اس کو بھی سنا، ظاہر ہے کہ محض گیارہویں آیت سننے سے یہ تو متعین ہو سکے گا کہ آیت صحیح اور پوری کی پوری لکھی گئی مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیت اپنے مقام یعنی گیارہویں جگہ پر لکھی گئی یا نہیں، جب تک کہ کاتب کے پاس پہلے کی دسوں آیتیں لکھی ہوئی نہ ہوں اور اس کا ربط ان آیتوں کے ساتھ نہ ہو سکے۔

یہ تو ممکن ہے کہ جس وقت کہ گیارہویں آیت لکھی جا رہی ہو عین اسی وقت بقرہ کی

دسوں آیتیں یا دسویں آیت موجود نہ ہو لیکن ناممکن ہے کہ لکھانے والا صرف اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ بعد کو گیارہویں آیت کو پچھلی دس آیتوں سے ملا لیا جائے اور خود اس بات کو نہ دیکھے کہ واقعتاً وہ اپنی جگہ پر لکھ بھی گئی یا نہیں۔

مانا کہ آنحضرت ﷺ پڑھ نہ سکتے تھے لیکن لکھا ہوا پڑھواتے اور سنتے ضرور تھے۔

اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ نزول وحی کے بعد آنحضرت ﷺ وحی کسی کاتب کو لکھا دیتے یا اس کا مقام بتا دیتے، وہ کاتب آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھ کر لکھ لیتا اور اپنے قرآن کو بالکل آخری نازل شدہ ترتیب کے ساتھ ''تالیف'' کر لیتا، اس طرح ہر کاتب کے پاس جو نسخہ ہوتا وہ اپٹوڈیٹ ہوتا، یہ سارا قرآن لوگ زبانی یاد کرتے، لکھ کر اپنے پاس رکھتے، اس کی تلاوت کرتے اور رمضان میں ہر سال ایک بار اس وقت نازل شدہ مکمل قرآن کو دہرا لیتے، خود غلام ربانی طبرانی کی روایت کان جبریل املی علی النبی ﷺ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اترنے کے ساتھ ہی جبرئیلؑ کے سامنے رسول اللہ ﷺ نازل شدہ آیتوں کو لکھوا دیا کرتے تھے۔

صرف لکھوانے پر قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو پڑھوا کر سنتے، جب یہ کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا تھا، جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ (ص ۲۸)

آگے چل کر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

> ''تولف القرآن .... میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے بلکہ جن جن سورتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتیں ان کو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دے کر لکھا کرتے تھے جن پر ان کو ہونا چاہیے تھا، بیہقی نے بھی تالیف کا مطلب یہ لکھا ہے کہ المراد تالیف مانزل من الآیات المفردۃ فی سورھا و جمعھا۔'' (ص ۳۷)

متن میں لکھتے ہیں:

"مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو ہوتے رہتے تھے، ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں تدریجاً قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کرامؓ کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے، مکمل ہوتے رہے۔"

یہ رائے اس سے متعارض معلوم ہوتی ہے جس کا اظہار غلام ربانی صاحب نے اس کے پہلے کیا ہے، خلافت صدیقی میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابتؓ نے قرآن کا جو نسخہ تیار کیا تھا تو آنحضرت ﷺ کی لکھائی ہوئی یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں، ایسی حالت میں یہ عجیب بات ہے کہ اس مکتوبہ ذخیرے میں صرف "سورۂ براۃ" کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں ان کو نہ مل سکیں، حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے کی عام رواج کی بھی روایت ملتی ہے۔

یہ دونوں باتیں بیک وقت کیسے صحیح ہو سکتی ہیں کہ عام صحابہ کرامؓ تو روزانہ اپنے صحائف مکمل کرتے جاتے تھے مگر خود کاتب وحی زید بن ثابتؓ اپنا نسخہ مکمل نہیں کر سکے اور نہ آنحضرت ﷺ کو اس کی فکر ہوئی کہ ایک مکمل نسخہ تیار ہو جائے اور وصال نبویؐ کے ایک سال گزرنے کے بعد جب حکومت کو فکر ہوئی کہ ایک مکمل نسخہ تیار ہو جائے تو زیدؓ کو پورا قرآن نہیں ملتا بلکہ اس کے ٹکڑے ملتے ہیں جن سے وہ ایک اپنا نسخہ ترتیب دیتے ہیں، یا تو حیاتِ طیبہ میں کوئی نسخہ مکمل و مدون ہوا ہی نہیں اور اگر ہوا تو ہر طرح مکمل رہا ہوگا اور اسی ترتیب سے تھا جیسا کہ اب ہے۔

دوسری بات جس کا اعادہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اگر بالفرض زیدؓ نے ان لکھی ہوئی یادداشتوں سے ایک مکمل نسخہ تیار کیا اور ان یادداشتوں میں سے ایک یادداشت گم تھی تو اس سے اس کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ کچھ یادداشتیں اسی طرح غائب ہو گئی ہوں اور نہ مل سکی ہوں۔

سورۂ براۃ کی آخری آیتوں والی حدیث پر انشاء اللہ آگے بحث کی جائے گی، اس موقع پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر یہ روایت صحیح مان بھی لی جائے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ علاوہ زیدؓ کے نسخے کے جو پوری طرح مکمل تھا، یہ آیتیں انہیں خزیمہ انصاریؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی ملی تھیں، گو یاد تو بہتوں کو رہی ہوں گی۔

دوسری بات قابل گزارش قرآن مجید کے ساتھ صحابہ کرامؓ کا ذوق اور شغف ہے، وہ اس کو زبانی یاد کر لیتے تھے، دن رات اس کو پڑھتے تھے، بعض ایسے حضرات بھی تھے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو ایک رات میں پورا قرآن ختم کرتے تھے جو صحابہ کرامؓ قرآن کو لکھ لیتے تھے اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

قرآن کو یاد اور اس کی تلاوت کرنے کا ایسا والہانہ شوق اور اس کے ابلاغ کا اس قدر شدید جذبہ ان میں تھا کہ لکھی ہوئی آیت نہ صرف لکھنے والے ہی کے پاس لکھی رہ جاتی تھی بلکہ آناً فاناً بہت سے بزرگوں تک پہنچ جاتی، جو اس کو یاد اور اپنے اوراد میں شامل کر لیتے۔

گو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے، پھر بھی دو ایک واقعات کا ذکر اس سلسلہ میں بے محل نہ ہوگا۔

تعلیم قرآن کا سلسلہ مکہ کے قیام کے زمانہ ہی سے شروع ہوگیا تھا، حضرت ابن ارقمؓ کے گھر میں رسول اکرم ﷺ نے ایک تلاوت خانہ قائم کیا تھا، جہاں لوگ بیٹھ کر کلام پاک پڑھا کرتے تھے، مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ کو بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد مدینہ اس غرض سے آپؐ نے بھیجا تھا کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں، مکہ ہی کے زمانۂ قیام کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی قرآن پڑھ رہے ہیں، عمرؓ آتے ہیں، بہنوئی کو زدوکوب کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو بہن سے کہتے ہیں کہ دکھاؤ کیا پڑھ رہی تھیں، وہ جری خاتون کہتی ہیں کہ تم ان لکھی ہوئی آیتوں کو اس وقت تک چھو نہیں سکتے جب تک پاک نہ ہولو، جب صحابہ کرامؓ کلام مجید کی تلاوت کرتے تو عورتیں گھروں سے نکل آتیں لڑکے کھیل بھول جاتے، راہ گیر سننے کھڑے ہو جاتے، سخن سنج اعجاز بیان سے مسحور ہو جاتے، شیریں بیان شاعر شعر کہنا اور شعر سننا چھوڑ دیتے اور بالآخر مخالفین تک کو ہار مان کر کہنا پڑتا ماھذا الا قول البشر جو

لوگ اب بھی ضد و مخالفت پر قائم رہے انہوں نے قرآن کا اعجاز دیکھ کر اس کو بلند آواز سے پڑھنے سے روک دیا۔

یہ تو مکہ کی زندگی اور مظلومیت کے دور کا حال تھا، جب مدینہ میں تشریف آوری ہوئی تو اصحابِ صفہ کے نام سے کوئی ستر اصحاب رسول اکرم ﷺ کی ایک مستقل جماعت کلام مجید پڑھنے اور پڑھانے کے لیے قائم کردی گئی، مولانا عبدالسلام ندوی اسوۂ صحابہؓ میں لکھتے ہیں:

> ''ہجرت کے بعد مسجد نبویؐ میں ایک مستقل حلقۂ درس قائم ہوگیا اور اصحاب صفہ شب و روز قرآن مجید کی تعلیم و تعلم میں مصروف رہنے لگے، سنن ابن ماجہ میں ہے: ایک دن رسول اللہ ﷺ کاشانۂ نبوت سے جو برآمد ہوئے تو مسجد میں دو حلقے نظر آئے، ایک میں لوگ تلاوت و دعا کرتے تھے اور دوسرے حلقے والے تعلیم و تعلم میں مصروف تھے، آپؐ نے فرمایا دونوں نیک کام کر رہے ہیں، ایک گروہ تلاوت و دعا کرتا ہے، دوسرا قرآن مجید کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، میں صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، یہ کہہ کر اسی حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔''(۱)

درس و تدریس کا یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا، مسند ابن حنبل میں ہے:

فكانوا اذا جنهم الليل انطلقوا الى معلم فيدرسون الليل حتى يصبحوا	جب رات ہوجاتی تو یہ لوگ کسی معلم کے پاس جاتے، وہ انہیں پوری رات درس دیتا تاآنکہ صبح ہوجاتی۔

اور یہ سلسلہ صرف صفہ ہی تک محدود نہ تھا بلکہ انصار کا ہر گھر مہمان خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مکتبِ قرآنی بن گیا تھا، چنانچہ باہر سے جو مہاجر آتے، رسول اکرم ﷺ ان کو انصار کے سپرد کردیتے، وہ مہمانداری کے ساتھ ساتھ اس دلسوزی سے ان کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے کہ لوگ نہایت شکر گزاری کے ساتھ واپس جاتے، چنانچہ وفد عبدالقیس آیا تو اس منت شناسانہ اعتراف کے ساتھ واپس گیا کہ:

---

(۱) اسوۂ صحابہؓ، حصہ دوم، ص ۲۲۵۔

ان الانصار یعلمون کتاب ربنا وسنة نبینا	انصار ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے ہیں۔

وفد بنو تمیم آیا تو مدت تک مدینہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔

نظام حکومت قائم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جو امراء و عمال مقرر فرمائے ان کا سب سے مقدم فرض کتاب اور سنت کی تعلیم دینا قرار پایا، استیعاب تذکرہ معاذ بن جبلؓ میں ہے:

بعثه رسول الله ﷺ قاضيا الى الجند من اليمن ليعلم الناس القرآن وشرائع الاسلام	حضرت معاذ بن جبلؓ کو آنحضرت ﷺ نے قاضی بنا کر یمن بھیجا تا کہ لوگوں کو قرآن اور شریعتِ اسلامی کی تعلیم دیں۔

اوپر لکھے ہوئے حقائق میں ایک بات اور یہ ملا لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کے گرد و پیش جو حضرات تھے اور جن کی تعداد انگلیوں پر شمار کر لیے جانے والے چند نفوس ہی نہیں تھے بلکہ ان کا ایک وسیع حلقہ تھا، ان حضرات کو جو شغف ذات نبویؐ سے تھا اس کی مثال دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی، بقول کارلائل ''محمدؐ کے اصحاب کی محمدؐ کے ساتھ شغف کی مثال حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں ڈھونڈنا عبث ہے، جب عیسیٰؑ پر کڑا وقت پڑا تو ان کے حواری کام نہ آئے، اس کے برخلاف محمدؐ کے اصحاب نے محمدؐ کی حفاظت داہنے سے کی، بائیں سے کی، آگے سے کی اور پیچھے سے کی۔''

کسی واقعہ کی صحیح نوعیت متعین کرنے کے لیے اس بات کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ جن حالات اور جس ماحول میں وہ واقعہ رونما ہوا ہے ان حالات کو تصور کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی جائے، اس ماحول کو اپنا ذہنی ماحول بنانے کی سعی کیجیے، اسی ذہنی فضا کو اپنی ذہنی فضا بنایئے، پھر اس فضا میں واقعہ متعلقہ کی تصویر کشی کیجیے تب کسی حد تک واقعہ کی روداد صحت کے ساتھ متعین کرنے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

اس پس منظر کے لیے ان حالات پر غور فرمایئے کہ آنحضرت ﷺ کے گرد و پیش جو حضرات ہیں ان کی قوت حافظہ بہت قوی ہے، وہ ہر چیز زبانی یاد رکھنے کے عادی ہیں اور

اس پر فخر کرتے ہیں، لکھنا وہ کم درجے کی چیز سمجھتے ہیں اور لکھتے ہیں تو صرف آنحضرت ﷺ کی خوشنودی طبع کے لیے۔

ذات نبویؐ سے ان حضرات کو شغف اور عشق سے بھی آگے اگر کوئی درجہ ہوسکتا ہے تو وہ ہے اس ذات گرامی کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور ہلکی سے ہلکی جنبش لب دنیا و مافیہا کی گراں قدر سے گراں قدر متاع سے زیادہ عزیز ہے، اس کی ایک جنبشِ ابرو پر دونوں جہاں نثار کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اس کی ایک ایک بات کو اس لیے یاد رکھتے ہیں کہ اس کو حرز جان بنائیں، اسے اپنی زندگی میں سموئیں اور آنے والی نسلوں کے لیے سرمایۂ سعادت چھوڑ جائیں، حتیٰ کہ وہ خود کہتا ہے کہ لاتکتبوا عنی غیر القرآن، اس لیے یہ حضرات ان اقوال وافعال کو قلم بند تو نہیں کرتے مگر زبانی یاد رکھتے ہیں، سلسلہ بسلسلہ اور سند بسند۔

یہ محض ایک عقیدت مندانہ بات نہیں ہے، تاریخی حقیقت ہے، صرف دو تین واقعے اس سلسلہ میں پیش کروں گا۔

سب سے پہلا واقعہ جنگ احد کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بڑی بی مدینہ میں رہتی ہیں، کوئی تین میل پر احد کی لڑائی ہو رہی ہے، خبر سنتی ہیں کہ محمدؐ شہید ہوگئے، بے تاب ہو جاتی ہیں، گھر سے نکل کر میدان جنگ کی طرف چل پڑتی ہیں، راستے میں جو ملتا ہے اس سے حضور اکرم ﷺ کی خبر پوچھتی ہیں، لوگ، شوہر، بھائی، باپ کے مارے جانے کی خبر دیتے ہیں، اس خاتون پر کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ اپنی دھن میں مست میدان کارزار کی طرف چہرۂ اکرم ﷺ کے دیدار کی تلاش میں والہانہ چلی جاتی ہیں اور جب روئے مبارک پر نظر پڑتی ہے تو کہتی ہیں:

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا

اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

یہ گھر میں بیٹھنے والی خواتین کا حال تھا جنہیں اتنا موقع خدمت نبویؐ میں حاضری اور کسب سعادت کا نہیں ملتا تھا جتنا حضرات صحابہ کرامؓ کو ملتا تھا، اس سے ذاتِ نبویؐ سے ان بزرگوں کے شغف وانہماک کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نماز عشا کے بعد تھوڑی دیر تک مقام بطحا میں

استراحت فرما کر مکہ میں داخل ہوئے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ہمیشہ اسی مقام پر کسی قدر سو لیتے تھے، پھر مکہ میں داخل ہوتے تھے، اسی طرح آپ اس سفر میں جہاں جہاں اترے تھے یا نماز پڑھی تھی وہ بھی وہاں ضرور اترتے اور نماز پڑھتے۔

حضرت ابوالدرداؓ جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے، ام الدرداؓ نے کہا کہ اس عادت کو ترک کر دیجیے ورنہ لوگ آپ کو احمق بنائیں گے (سمجھیں گے)، بولے میں نے رسول اللہ کو دیکھا ہے کہ جب کوئی بات کہتے تو مسکرا دیتے تھے۔

حضرت علیؓ ایک بار گھوڑے پر سوار ہوئے، دائیں رکاب میں پیر رکھا، دعا پڑھی اور پیٹھ پر بیٹھ گئے تو مسکرانے لگے، لوگوں کے پوچھنے پر کہا کہ آنحضرتؐ نے ایسا ہی کیا تھا۔

ایک صحابیؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو قمیص کا تکمہ کھلا دیکھا، عمر بھر قمیص کا تکمہ کھلا رکھا، اس قسم کے اور بھی سیکڑوں واقعات ہیں جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے والہانہ عشق کے شاہد ہیں۔

اس ماحول اور اس ذہنیت کے پس منظر میں اس امر کا جائزہ لیجیے کہ کیا اس میں یہ ممکن تھا کہ اس ذات گرامیؐ کی محبوب ترین چیز جسے وہ بڑے اہتمام سے لکھاتا ہے، لوگوں کو یاد کراتا ہے، ان سے یاد کیا ہوا سنتا ہے، خود انہیں اپنا یاد کیا ہوا ہر رمضان میں سناتا ہے، اس محبوب ترین چیز کو لوگ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف لکھیں تو مگر اس طرح کہ اس کے محفوظ رہنے کی کوئی قابل اطمینان حالت نہ ہو۔

اس کے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ اصحاب نبی کریمؐ میں بہت سے ایسے بزرگ تھے جنھیں قرآن زبانی یاد تھا اور جنھوں نے اس کو لکھ لیا تھا، اس میں وہ سات قراء بھی تھے جن کی قرأتیں متداول ہوئیں، ان قراء میں سے ہر ایک اپنی قرأت کی سند رسول اکرمؐ تک پہنچاتا ہے اور انہی قرأتوں کی امت اسلامیہ آج تک پابند ہے۔

اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ سورۂ قیامہ کی آیت ''وقیل من'' کے بعد قاری تھوڑی دیر وقفہ کے لیے ٹھہرتا ہے پھر ''راق'' پڑھتا ہے، حالانکہ ایسے اور بہت سے مواقع کلام مجید میں ہیں جہاں اس قسم کا وقف نہیں ہوتا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس مقام پر یہ

ہلکا وقف آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔

غور کیجیے تو یہ بڑی اہم بات ہے، ایک قلیل جزئیہ کو اس احتیاط کے ساتھ یاد رکھنا اور اس کی پابندی اس طرح کرنا کہ آج پورے تواتر کے ساتھ یہ ذرا سی بات بھی بالکل ایک ہی انداز سے سارے ممالک اسلامیہ میں جاری ہے، اس ذہنیت کا پتہ دیتی ہے جس کو قرآن کی حفاظت سپرد کی گئی تھی اور جو ذہنیت اس معمولی چھوٹی سی بات کو چودہ سو برس سے اپنے سینے سے اس طرح لگائے ہوئے ہے کہ اس کا بدل جانا ناممکن ہے، اس سے یہ بدظنی رکھنا کہ قرآن کی اس ترتیب کو یاد نہ رکھے گی جس ترتیب سے آنحضرت ﷺ نے اسے مرتب کیا تھا، یہ بات کسی طرح دل کو نہیں لگتی۔

☆☆☆

یہاں پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر قرآن مربوط اور منضبط تھا تو پھر حضرت ابو بکرؓ کی ہدایت فاجمعہ کے کیا معنی ہیں؟ یہ اعتراض برمحل بھی ہے اور وزنی بھی، اس کے جواب کا ایک رخ تو یہ ہے کہ یہ روایت جو زہری کی ہے غیر معتبر ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو غیر معتبر ہونے کے جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو بیک نظر مسترد کر دیا جائے، اس روایت کی سند وغیرہ پر تو بعد میں غور کیا جائے گا، فی الحال یہ مان لیجیے کہ یہ روایت صحیح ہے، ورنہ بخاری جیسا ناقد حدیث اس کو اپنی کتاب میں جگہ کیوں دیتا، تب بھی کوئی بات اس حکم میں سمجھ سے باہر نہیں، مشکل ضرور ہے۔

پھر اس ماحول کا سہارا لیجیے جسے میں نے اوپر عرض کیا ہے، کیفیت یہ ہے کہ آٹھ دس صحابہ کے پاس لکھے ہوئے مدون، مرتب اور مکمل قرآن موجود ہیں مگر ان نسخوں پر کوئی تصدیق نہیں، یعنی کسی نے اس کی توثیق نہیں کی، آج کل کی دفتری زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ کوئی ''سرٹیفائڈ کاپی'' اس مصحف کی نہیں ہے۔

آپ غور کریں کہ آنحضرت ﷺ لکھنا نہ جانتے تھے، جتنے دعوت نامے آپؐ نے لوگوں کو بھیجے تھے، وہ دوسرے لوگ لکھتے تھے، آنحضرت ﷺ ان پر مہر لگاتے تھے، صلح نامۂ حدیبیہ لکھا، دوسروں نے اس کی توثیق اور تصدیق آپؐ نے کی، یمن کے حاکم کو ہدایت نامہ بھیجا گیا تو سرٹیفائڈ آپؐ نے فرمایا کہ یہ ہدایت ٹھیک ہے تو پھر اگر قرآن کے کسی نسخے پر آنحضرتؐ کی مہر کا مطالبہ کیا جاتا یا اب کیا جائے تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔

یہ مانا کہ آنحضرتؐ کے وصال کے وقت قرآن مجید کے ایک درجن لکھے ہوئے نسخے موجود تھے مگر ان میں مہر کسی پر نہیں تھی کہ یہ نسخہ آنحضرتؐ کا دیکھا ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بڑی جماعت کے پاس قرآن مجید کے کچھ حصے ہیں

جو ان کو یاد میں محفوظ ہیں، کچھ کے پاس لکھے ہوئے حصے ہیں، پتھر پر لکھے ہوئے، ہڈیوں پر لکھے ہوئے، رقاع پر لکھے ہوئے مگر یہ لکھے ہوئے حصے ایسے ہیں جو بیک وقت نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ان میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حصہ دوسرے سے مختلف ہو۔

شاید یہ بات ناگوار معلوم ہو کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے سے مختلف کیسے ہوسکتا ہے لیکن اگر آپ ایک لحہ کے لیے تحمل سے کام لیں اور اس پر غور کریں کہ آیات کی ترتیب نزول کے وقت بحکم خداوندی متعین ہوتی تھی تو آپ اس نتیجہ سے متفق ہوں گے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

اس کی بہت واضح مثال سورۂ بقرہ کی دوسو اسّی آیت والی حدیث سے ملتی ہے، سورۂ بقرہ مدنی ہے، یہ آیت مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی، اب فرض کیجیے کہ زید کے پاس سورۂ بقرا اس آیت کے نزول سے کچھ دن پہلے کی لکھی ہوئی تھی اور بکر کے پاس اس کے نزول کے بعد کی تو دونوں ٹکڑوں میں اختلاف ہوگا۔

پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ قرآن کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ جس احتیاط کو لازم سمجھتے تھے اس کی ایک مثال آج تک کتبِ احادیث میں موجود ہے، حضرت عمرؓ جیسا جلیل القدر صحابی زید بن ثابتؓ کو یہ آیت سناتا ہے:

مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

زیدؓ کہتے ہیں کہ مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے اور (قیاساً) جیسا کہ میرے پاس لکھی ہوئی بھی موجود ہے، اس میں انصار اور الذین کے درمیان ایک واو بھی ہے، اب تحقیق شروع ہوتی ہے اور جب شہادت زیدؓ کے موافق مل جاتی ہے تو مصحف میں آیت اسی طرح لکھی جاتی ہے، جس کتاب کا نسخہ تیار کرنے میں اتنی احتیاط برتی جائے اور جو طبائع اس احتیاط کو لازم سمجھتے ہوں وہ کیوں کر اس پر مطمئن ہوسکتے تھے کہ صرف زیدؓ یا اور آٹھ دس حضرات کے پاس جو نسخے ہیں اور جو بہر کیف مصدقہ نہیں ہیں، وہ اس بات کی مسلمہ شہادت ہوسکتے ہیں کہ یہ مصاحف یا ان میں سے کوئی ایک بعینہٖ وہی ہے جس کو حضور اکرمؐ نے اخیر وقت میں مکمل کرایا تھا اور یہ بھی نہ بھولیے کہ بہت سے مسلمانوں کے پاس ایسے لکھے ہوئے ٹکڑے

کلام مجید کے محفوظ تھے جو آخری نسخہ سے مختلف تھے، ان مرتب شدہ مصاحف اور ان ٹکڑوں میں اختلاف باعث انتشار ہوسکتا تھا، خصوصاً اس وقت جب کہ وہ بزرگ ہستیاں جن کو حضور انورؐ نے قرآن پڑھانے کی اجازت دی تھی اس دنیا میں نہ رہ جائیں۔

اگر ان حالات میں کسی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر قرآن کا ایک مصدقہ نسخہ جمع نہ کرلیا گیا تو ''کثیر من القران'' کا ''ذھاب'' ہوجائے گا تو خدشہ بالکل فطری تھا اور اگر خلیفۂ وقت سے یہ استدعا کی گئی کہ آپ بحیثیت خلیفۂ اسلام کے اس مہم کو ہاتھ میں لیں اور ایک نسخہ ایسا لکھوائیں جس کے اوپر آپ کی مہر تصدیق ثبت ہو تو یہ کون سا گناہ تھا اور اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ قرآن مرتب نہ تھا یا کم از کم اس کی سورتیں ایک مربوط انداز سے جمع نہ تھیں۔

ان حالات میں جو خلیفۂ وقت تھا اس کا رویہ ہونا چاہیے تھا۔

ایک تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے حکم سے یہ فیصلہ کردیتا کہ زید کا جو مصحف ہے وہی صحیح مصحف ہے، سب لوگ اس کی پابندی کریں، یہ طریقہ کار بہت سہل اور تمام آمرانہ کاموں کی طرح جھگڑوں سے پاک ضرور ہوتا مگر اس جمہوری روح کے منافی ہوتا جس کا دوامی پیغام لے کر اسلام آیا تھا۔

اس کے علاوہ اگر ایسا کیا جاتا تو بکر جس کے پاس زید کے مصحف سے مختلف لکھا ہوا کوئی ٹکڑا ہوتا، اس کو کیسے مطمئن کیا جاسکتا کہ اس کا لکھا ہو مصحف نامکمل ہے یا درست نہیں ہے اور بکر کو یہ کہنے کا حق باقی رہتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی ایک نسخہ کی تصدیق کرنے سے پہلے لوگوں کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ اس کے پاس جو ذخیرہ قرآن مجید کا ہے اسے وہ آپ کے سامنے پیش کرسکیں اور حضرت ابوبکرؓ اس کی خامیاں ظاہر کرکے اس کو مطمئن کرسکیں کہ اس کا نسخہ نامکمل ہے اور ہر غیر جانبدار منصف مزاج اس کی تائید کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب یہ پالیسی طے کرلی گئی کہ قرآن کا ایک مستند نسخہ خلیفہ کے لیے لکھ کر جمع (فراہم) کردیا جائے تو حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ میں اعلان کیا کہ جس کسی کے پاس قرآن کا جو ٹکڑا ابھی موجود ہو وہ لے آئے اور زیدؓ کے سامنے پیش کرے۔

یہی طریقہ حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کیا، آپ نے ایک نوجوان اور عاقل کاتب

وحی کو جس نے عرصۂ اخیرہ میں خود نبی اکرمؐ کی زبانی قرآن سنا تھا، جس نے اپنا لکھا ہوا قرآن آنحضرتؐ کو سنایا تھا، اسی کام پر متعین کیا کہ وہ ایسا نسخہ تیار کرے اور اعلان کیا کہ جس کسی کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو، یا زبانی یاد ہو وہ اس کو ''جامع قرآن'' کے سامنے لا کر پیش کرے اور اس جامع قرآن کا فرض ہوگا کہ وہ اس پیش کردہ حصے کی صحت پر پہلے اس کی دو شہادتیں لیں کہ یہ حصہ بعینہٖ اسی ترتیب سے ہے جس طرح حضور اکرمؐ سے سنا گیا اور جب یہ بات متعین ہو جائے تو پھر اسے اپنے نسخے سے مقابلہ کر کے مستند نسخہ میں لکھ دے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام بڑی ذمہ داری کا تھا اور کوئی شخص بھی جسے اپنے فرض منصبی کا احساس ہو، اس کی ہامی بھرنے سے پہلے بار بار سوچے گا کہ آیا وہ اس ذمے داری کو اٹھانے کے قابل ہے یا نہیں۔

قرآن مجید جیسی کتاب کا ایسا نسخہ تیار کر کے اسے قیامت تک کے لیے جاری کر دینا جس میں جمع کرنے والے کے ایمان کے مطابق نہ صرف اس دنیا میں بلکہ دوسرے عالم میں بھی جواب دہی کرنا تھی، کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا، زیدؓ کا کہنا کہ اگر مجھے پہاڑ ہٹانے کا حکم دیا جاتا تو بھی میں اس کو اس کام کے مقابلہ میں آسان سمجھتا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ کام اس لیے ان کو مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے ہزاروں غیر مرتب اور غیر مربوط ٹکڑوں کو جمع کر کے مرتب اور اڈٹ کرنا پہاڑ ہٹانے سے زیادہ مشکل نظر آیا بلکہ اس احساس ذمہ داری کو ظاہر کرتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اللہ تربت ٹھنڈی رکھے زید بن ثابتؓ کی اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابن ابی قحافہؓ کو ایک کی سرکردگی میں دوسرے نے وہ کام کیا جس سے ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت ہو گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اور ایک حقیقت ذہن نشین کر لیجیے۔

بہت سی متفرق چیزوں کو آپس میں منسلک اور مربوط کرنے کے طریقے ان کی تعداد کے لحاظ سے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کا گمان بھی اول نظر میں نہیں ہوتا۔

فرض کیجیے کہ دو عددوں ۱-۲ کو آپ دو ترتیبوں سے رکھ سکتے ہیں، اور ۲-۱ وا، لیکن

اگر آپ اس میں ایک عدد اور بڑھا دیجیے اور تین عددوں کو آپس میں مرتب کرنا شروع کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اب انہیں تین نہیں، چار نہیں بلکہ چھ (۲×۳) طریقوں سے مرتب کیا جاسکتا ہے (۱-۲و۳-۱و۳و۲-۲و۱و۳-۲و۳و۱-۳و۱و۲-۳و۲و۱) اب سات عددوں کو لیجیے، اس کے ممکن طرق کی مجموعی تعداد (۲×۳×۴×۵×۶×۷) ۵۰۴۰ ہوتی ہے یعنی اگر سورۂ فاتحہ کی آیات کو ترتیب دینا شروع کیجیے تو وہ پانچ ہزار چالیس طریقوں سے مرتب کی جاسکتی ہیں، اس سے آپ قرآن کی موجودہ سورتوں کی ترتیب کا قیاس کرسکتے ہیں جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔

ایسی حالت میں ایک ہی طریق ترتیب پر لوگوں کا اجماع کیوں ہوا اور قرآن جیسی کتاب کے لیے اور وہ بھی کل اٹھارہ مہینوں کی قلیل مدت میں یہ سارا کام نپٹا لیا گیا، درآنحالیکہ وہ بزرگ جن کے پاس قرآن کے حصے موجود تھے وہ اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، بعضے تو تین تین دن کی مسافت طے کرکے آتے تھے اور اپنا لکھایا یاد کیا ہوا قرآن کا حصہ پیش کرتے تھے، اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جمع قرآن کا کام یہ نہیں تھا کہ مختلف لوگوں سے لے کر قرآن کی سورتیں جمع کردی جائیں، پھر انہیں من مانے طریقے سے مرتب کردیا جائے بلکہ اس کا وہی مطلب ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ اگر قرآن کے حصے مختلف ایسے حضرات کے پاس تھے جو سارے جزیرۃ العرب میں پھیلے ہوئے تھے تو اس بات کے چک کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی کہ سارے اجزا جمع ہوگئے ہیں یا نہیں اور یہ امکان باقی رہتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اس ذخیرہ کے جمع کرنے سے رہ گیا ہو مگر یہ شبہہ چنداں قابل توجہ نہیں کیوں کہ اس شبہہ کے خلاف وہ سلبی شہادت دلیل ناطق ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے۔

ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ جیسے جیسے قرآن پر تحقیق ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے یہ بات روشن ہوتی جاتی ہے کہ آیات کی ترتیب تو ہے ہی، سورتوں کی ترتیب بھی ایک خاص اسکیم کے مطابق ہے اور ایک سورہ کا اخیر اور دوسرے کا شروع باہم مربوط ہیں، مثلاً سورۂ نساء کا آخر انسان کو توحید اور عدل کی تعلیم دیتا ہے، سورۂ مائدہ جو متصلاً

اس کے بعد شروع ہوتی ہے اس کی ابتدا بھی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ یعنی ایمان و عدل کی تعلیم سے ہوتی ہے، اگر اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ انسان نے ازل میں توحید کا عہد و پیمان کیا تھا اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جو وعدہ کیا جائے پورا کیا جائے تو اس ترتیب کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے، سورۂ واقعہ کے اخیر میں تسبیح کا حکم ہے اور اس کے بعد کی سورۂ حدید بھی تسبیح سے شروع ہوتی ہے، سورۂ ماعون میں چار باتوں کی مذمت کی گئی ہے، ترکِ صلوٰۃ، ریا کاری، بخل اور منع زکوٰۃ، اس کے بعد متصلاً سورۂ کوثر ہے جس میں اس کے تقابل کے چار اوصاف بیان کیے گئے ہیں، بخل کے مقابل انا اعطیناك الكوثر، ترک صلوٰۃ کے مقابل ''فصل'' نماز کا حکم، ریا کاری کے مقابل لربك یعنی اپنے رب کے واسطے دکھاوے کے لیے نہیں اور منع زکوٰۃ کے مقابل میں وانحر یعنی قربانی کر کے لوگوں کو کھلاؤ پلاؤ۔

میں نے یہاں صرف چھ سورتوں کا ذکر کیا ہے، نساء، مائدہ، واقعہ، حدید، ماعون اور کوثر، صرف ان چھ سورتوں کو آپس میں ۷۲۰ (۲×۳×۴×۵×۶) طریقوں سے مرتب کیا جا سکتا تھا، ان سات سو سے اوپر طریقوں میں سے صرف وہ طریقہ کیسے ہاتھ لگ گیا جو ان کی ترتیب کا بہترین طریقہ تھا، اس کو بخت و اتفاق نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ بخت و اتفاق ایک مرتبہ یا چند مرتبہ یا کچھ اس سے بھی زیادہ پیش آسکتا ہے مگر ایک ہی طرح کے لاکھوں واقعات کو بخت و اتفاق کسی طرح نہیں کہا جا سکتا، اس لیے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ سورتوں کی ترتیب میں کوئی باہمی کوئی ربط ہے اور اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ یا تو یہ ترتیب خود صاحب قرآن کی دی ہوئی ہے۔

۲۔ یہ محض ایک معجزہ ہے۔

دونوں صورتوں میں یہ امر یقینی ہے کہ یہ کام امت کا نہیں ہے، خواہ وہ امت خیر القرون کی ہی کیوں نہ ہو، اس لیے اس نتیجہ پر پہنچے بغیر چارۂ کار نہیں ہے کہ ترتیب سورہ انسانی نہیں بلکہ الہامی ہے۔

حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن عسیب، لخاف اور صدور الرجال سے جمع

کیا ہے(۱) اس کا مطلب بھی صرف یہی ہے کہ یہ سب کام اس نسخہ کو مرتب کرنے کے لیے کیا گیا تھا جو خلیفۂ وقت کے پاس رکھا جاتا تھا۔

مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت زیدؓ کا طریق کار وہی تھا جو آج کل کے محققین کرتے ہیں یعنی پہلے اس تمام مواد کو جو کسی موضوع پر فراہم ہوسکتا ہے، جمع کرتے ہیں، پھر اس کی چھان بین کرتے ہیں اور جو چھان بین سے صحیح ثابت ہوتا ہے اس سے ایک کتاب مرتب کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی منادی کے بعد صحابہؓ دور دور سے آتے اور قرآن کا جو حصہ انہیں یاد ہوتا، یا جو ان کے پاس لکھا ہوا ہوتا اسے زیدؓ کے سامنے پیش کرتے، زیدؓ کو قرآن مجید زبانی بھی یاد تھا اور ان کے پاس لکھا ہوا بھی موجود تھا، پھر بھی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ خود اپنی یاد اور اپنی مکتوبہ تحریر سے مقابلہ کرلینا کافی تصور نہیں کیا بلکہ اسلامی اصول شہادت کے مطابق اس کی دو گواہیاں لیتے تھے کہ قرآن کا جو حصہ پیش کیا گیا ہے اسے نبی کریم ﷺ سے بعینہٖ اسی طریق سے سنا گیا تھا۔

آج کی دوڑ دھوپ کی دنیا میں اس احتیاط کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی کے قول کی صحت کی تحقیق کے اتنی چھان بین کی ضرورت ہے اور ایسا عملاً ممکن بھی ہے یا نہیں اور پھر اہتمام کے ساتھ کہ نہ صرف کہنے والے کا مطلب ادا کردیا جائے بلکہ بعینہٖ اور بجنسہٖ وہی الفاظ بھی استعمال کیے جائیں اور اس ترتیب اور وقفہ کے ساتھ جس طرح کہنے والے نے کہا تھا اور زبان وحی ترجمان سے قرآن کا جو لفظ بھی جس طرح ادا ہوا تھا وہ بلا ادنیٰ تغیر کے ٹھیک ٹھیک اسی طرح ادا کیا جائے اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت تک دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی ایسی نہیں ہے جس میں اس احتیاط سے کام لیا گیا ہو۔

اسے مان لینے میں تامل نہیں کہ یہ بحث زیادہ تر ترتیب آیات کو ثابت کرتی ہے اور ترتیب سور سے اس کا تعلق دور کا ہے مگر تعلق سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے یہ بحث

---

(۱) عسیب کھجور کی شاخ اور عام قسم کے درختوں کا وہ حصہ جو تنہ سے متصل ہوتا ہے، لخاف بیضوی رنگ کے پتھر کی چوڑی تختیاں۔

ترتیب سور بالکل غیر متعلق بھی نہیں ہے کیوں کہ جب آیات کی ترتیب ایک نہج پر قائم ہوگئی تو سورتوں کی ترتیب بھی بالواسطہ اسی طرح قائم ہوئی۔

اس کو زیادہ واضح طور پر یوں سمجھیے کہ بفرض محال ایک شخص کو قرآن اس طرح یاد ہے کہ پہلے سورۃ الناس، پھر فلق، پھر کوثر، پھر اخلاص، دوسرے شخص کو فلق، پھر کوثر، پھر اخلاص، تیسرے کے پاس لکھی ہوئی ترتیب کچھ اور ہے۔

جب یہ سب ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں تو ''جامع'' قرآن کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے نسخہ میں ان سورتوں کو کس ترتیب سے لکھے، یوں ہی رہنے دے، قرعہ ڈالے، استخارہ دیکھے اور بخت و اتفاق کے ہاتھوں ترتیب سور کا فیصلہ کرائے یا خود اپنی ذہانت اور دوسرے ساتھیوں کی اعانت سے اس ترتیب کو طے کرے۔

ترتیب سور کوئی اہم چیز ہے یا نہیں، اس کے متعلق اوپر عرض کیا جا چکا ہے، اگر ترتیب سور میں بھی قرآن کی کوئی اسکیم ہے، جیسا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو نتیجہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ترتیب سور کی اسکیم خود نبی کریم ﷺ متعین فرما گئے تھے، اس کی ترتیب حسب ذیل ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ''عرضۂ اخیرہ'' میں رسول اکرمؐ نے پورا قرآن دوبارہ حضرت جبرئیلؑ کو سنایا تو کیا دونوں بار علاحدہ علاحدہ ترتیب سے قرآن سنایا گیا یا ایک ہی ترتیب سے۔

حضرت زیدؓ کے پاس لکھا ہوا قرآن کا جو نسخہ تھا اس میں لازمی طور پر سورتیں کسی ترتیب ہی سے رہی ہوں گی، ''عرضۂ اخیرہ'' میں زیدؓ اور ابی بن کعبؓ دونوں شامل تھے، اگر اس میں آنحضرت ﷺ کی تلاوت کی ترتیب زیدؓ یا ابی بن کعبؓ کے نسخے کی ترتیب سے مختلف تھی تو زیدؓ یا ابی بن کعبؓ کو یہ بات کیوں نہیں کھٹکی کہ جس ترتیب سے نبی کریمؐ نے قرآن سنایا ہے اس ترتیب سے وہ اپنے نسخہ کو مرتب کریں۔

جو کلام رٹ لیا جائے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر اس کی ترتیب الٹ پلٹ دی جائے تو حافظ آسانی سے اپنی یاد سے اس بدلی ہوئی ترتیب سے نہیں سنا سکتا، یادداشت کی کمی بیشی کی کیفیت ٹیپ ریکارڈ کی جیسی ہوتی ہے، اس میں جس ترتیب سے آواز

بھری جائے گی اسی ترتیب سے اسے چلانے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ جس ترتیب سے یاد ہے اگر اس ترتیب سے سنایا جائے تو اس کا امکان نہیں رہ جاتا کہ کوئی حصہ سنانے سے رہ گیا ہے اور بلا ترتیب گڈمڈ طریقہ سے سنانے میں اس کا امکان رہتا ہے۔

اس کا بڑا آسان تجربہ ہے، ایک سے سو تک گنتی کس کو یاد نہ ہوگی، اس گنتی کو یاد سے بلا ترتیب لکھنے کی کوشش کیجیے تو دیکھیے کہ کتنی مرتبہ میں آپ پوری گنتی لکھ پاتے ہیں، اس عمل میں ہر مرتبہ آپ کو بار بار یہ غور کرنا پڑے گا کہ کوئی عدد چھوٹ تو نہیں گیا ہے۔

قرآن میں تو سو سے بھی زیادہ ایک سو چودہ سورتیں ہیں، ان سب کو ایک ساتھ سنا دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب یہ سب سورتیں ایک سلسلہ میں منسلک ہوں اور یہ سنانا صرف ایک ہی دفعہ نہ ہو بلکہ تین دفعہ ہوا ہو، عرضۂ اخیر میں آنحضرت ﷺ نے دو بار قرآن سنایا اور حضرت زیدؓ نے بھی اس سال ایک بار قرآن سنایا۔

یہ مانا کہ آنحضرت ﷺ کی قوت حافظہ غیر معمولی تھی اور یہ بھی مان لیا جائے کہ آپ کا معجزہ تھا کہ غیر منسلک سورتوں کو شروع سے اخیر تک بغیر کسی کمی اور زیادتی کے ایک بار نہیں بلکہ دو بار سنا دیا لیکن حضرت زیدؓ تو یہ معجزہ نہیں دکھا سکتے تھے، ان کو قرآن سن کر یہ کیسے اطمینان ہو گیا کہ پورا قرآن بلا کم وکاست انہوں نے سن لیا ہے اور ان کا یہ اطمینان اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن سننے کے بعد انہوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے پورا قرآن سنا دیا ہے یا نہیں، کیوں کہ اس کی کوئی روایت نہیں ملتی اور یہ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جب کہ آنحضرت ﷺ کی ترتیب تلاوت سور بعینہٖ وبجنسہٖ وہی ہوتی ہے جیسی کہ زیدؓ اور ابی بن کعبؓ کے مصحفوں میں تھی۔

ایک اور چھوٹی سی بات جو اس سلسلہ سے ذہن میں رکھنے کی ہے یہ ہے کہ متعدد کتب احادیث میں یہ روایت ملتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

ا۔ سبع طوال: بقرہ سے یونس تک۔

۲۔ مائین: یونس کے بعد کی سورتیں جن میں سو سے کم آیتیں ہیں۔
۳۔ مثانی: مائین کے بعد کی سورتیں سورۂ قاف تک۔
۴۔ مفصل: ق سے والناس تک۔

تلاوت میں سہولت کے لیے قرآن مجید کو مختلف حزبوں میں تقسیم کرلیا گیا تھا، اوس بن حذیفہ ثقفی کے بیان کے مطابق ان حزبوں کی تقسیم تین، پانچ، سات، نو، گیارہ اور حزب مفصل پر تھی۔

اس روایت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

"سألنا اصحاب رسول الله ﷺ عن احزاب القرآن كيف تحزبونه فقالوا ثلاث و خمسين وسبع وتسعة واحدى عشر و حزب المفصل۔"

یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں ثقیف کے وفد کے موقع پر پیش آیا، مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "بقرہ اور آل عمران پڑھو"، بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیا میرا خزانہ ہے"، ایک دوسری حدیث ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ بستر استراحت پر تشریف لے جاتے تھے تو اخلاص، فلق اور الناس پڑھ کر دم کر لیتے تھے، بعینہٖ یہی ترتیب کلام مجید کی سورتوں کی آج بھی ہے۔

اس سے پہلے سر ولیم میور کی یہ رائے پیش کی جا چکی ہے کہ قرآن میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ورنہ محمدؐ کے راوی جنہوں نے محمدؐ کی چھوٹی سے چھوٹی بات روایت کی ہے اسے ضرور روایت کرتے، یہ اعتراف اس لیے ناگزیر تھا کہ واقعۂ سیرت طیبہ کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی روایت میں موجود ہیں، اس کی وجہ اولاً تو یہ تھی کہ اصحاب نبی کریم کو ذات نبویؐ سے بے انتہا عشق تھا، دوسری بڑی وجہ یہ حکم تھا کہ خواہ ایک آیت ہو یا ایک چھوٹا سا جزئیہ میرے متعلق ہو تم لوگ دوسروں تک پہنچا دو۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کی کوئی ہستی ایسی نہیں ملتی ہے جس کی زندگی کے متعلق اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں، اتنی جزئیات، اتنی تفصیل سے قلم بند کی گئی ہوں، جتنی اس ذات گرامی ﷺ کے متعلق لکھی گئیں اور جسے آج سبھی لوگ اسی ذوق و شوق سے پڑھتے اور اس پر کار بند

ہونے کی کوشش کرتے ہوں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے نپولین کی ایسی شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ظاہر ہوئی اور جس کے حالات بہت ہی تفصیل سے مرتب کیے گئے لیکن اس کی زندگی کے متعلق بھی وہ تفصیلات نہیں ملتیں جو آنحضرت ﷺ کے متعلق ملتی ہیں اور جہاں ان جزئیات کا تعلق کسی مذہبی معاملہ سے ہو وہاں تو اس کی ہلکی سے ہلکی جنبشِ لب، ہلکے سے ہلکے اتار چڑھاؤ بھی سپردِ قلم کر دیا گیا ہے، نمونۃً اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

عن انسؓ انه سئل عن قرأة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال كانت مداثم قرأ بسم الله الرحمن الرحيم، بمد الله وبمد الرحمٰن (اتقان)	حضرت انسؓ سے رسول اکرم ﷺ کی قرأت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے کہا کہ آپ کھینچ کر پڑھتے تھے، پھر بسم اللہ پڑھی اور لفظ اللہ اور الرحمٰن کو کھینچ کر پڑھا۔

بخاری شریف میں ہے:

كان يمد بسم الله ويمد الرحمن ويمد الرحيم	بسم اللہ کو کھینچ کر پڑھتے اور الرحمٰن اور الرحیم کو مد کے ساتھ پڑھتے۔

شمائل ترمذی میں روایت ہے:

عن يعلىٰ بن مالك انه سئل ام سلمة عن قرأة رسول الله فاذا هي تنعت قرأته مفسرة حرفا حرفا	حضرت ام سلمہؓ سے رسول اکرمؐ کی قرأت کا طریقہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے وضاحت سے حرفاً حرفاً بیان کیا۔

اسی شمائل میں شعبہ کی ایک روایت ہے کہ جب سرکار دو عالمؐ مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے تو آپؐ کی زبان پر سورۂ فتح تھی، اس کے بعد کہتے ہیں:

قال ورجع	آپؐ نے ترجیع فرمائی۔

ایک اور روایت اسی کتاب کی ہے جس میں ہے کہ:

كان النبي حسن الوجه حسن الصوت وكان لا يرجع	آنحضرت ﷺ خوش جمال، خوش آواز تھے اور ترجیع نہیں کرتے تھے۔

یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ ترجیع کرتے تھے یا نہیں، مقصد صرف اس قدر ہے کہ اصحاب نبی کریمؐ آپ کی ادنیٰ سے ادنیٰ بات کو روایت کرتے تھے اور جس بات کا تعلق مذہب یا اس کے سرچشمہ قرآن سے ہوتا تھا اس کو اس تفصیل سے یاد رکھتے تھے کہ کس حرف کو آپ نے کس طرح ادا کیا اور کس لفظ کو کھینچ کر پڑھا اور اس پر اصرار کرتے تھے کہ قرآن بالکل اسی طرح پڑھا جائے جس طرح رسول اکرمؐ نے تعلیم دی ہے، بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہشام کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا تو ان کی گردن میں چادر ڈالی، رسول اکرمؐ کی خدمت میں گھسیٹ لائے اور عرض کی کہ انی سمعت هذا یقرأ القرآن غیر ما اقرأتنیها کہ یہ قرآن اس طرح نہیں پڑھتے ہیں جس طرح آپؐ نے ہم کو پڑھایا ہے۔

رموز اوقاف قرآن جو قرآن کے ہر نسخہ کے شروع میں تحریر ہوتے ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیں، پھر خود کلام مجید کا کوئی صفحہ کھولیے، آپ دیکھیں گے کہ بہت سی جگہوں پر رکنے اور بہت سی جگہوں پر نہ رکنے کا، کہیں وصل کا، کہیں فصل کا، کہیں بغیر سانس توڑے ہوئے، ایک خفیف وقفہ کا اشارہ ملے گا اور اس میں سے ہر چیز ذات گرامیؐ کے عمل پر منتہی ہوتی ہے۔

اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں: سات قاری تھے، عثمانؓ، علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابن مسعودؓ، ابو الدرداؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ، ان لوگوں کی قرأتوں میں کہیں مخارج حروف اور ان کی کیفیت ادا میں اختلافات واقع ہو گئے تھے، بعض لوگوں نے اختلافات کو منضبط کرنا شروع کیا، یہی لوگ قرا کے نام سے موسوم ہوئے، ہر ایک قرأت کو اپنے شیوخ و اساتذہ سے نقل کرتا تھا، یہ روایتیں مسلسل باسناد ہوتی تھیں (۱)

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کلام مجید کے متعلق جہاں اتنی تفصیل سے باتیں یاد رکھی گئیں کہ آیت کے کس لفظ کو آنحضرت ﷺ نے کھینچ کر پڑھا، کسے ملا کر پڑھا، کہاں وقف کیا، کہاں سانس توڑی، کہاں نون باعلان پڑھا، کہاں نہیں پڑھا، اس کتاب کے متعلق...... لوگوں نے یہ یاد نہ رکھا کہ کون سی سورہ پہلے ہے اور کون سی بعد میں، اس کو کون سی عقل تسلیم کرتی ہے۔

ایک روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے آل عمران پہلی رکعت میں پڑھی، بقرہ

---

(۱) تاریخ القرآن۔

دوسری رکعت میں، یہ اور اسی قسم کی دوسری حدیثیں جو سورتوں کی قرأت کے متعلق پائی جاتی ہیں، ان میں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

پہلی یہ کہ ان حدیثوں سے نہیں معلوم ہوتا کہ کس زمانہ کا واقعہ ہے، آپ اگر میرے اس نظریہ سے متفق ہیں کہ قرآن ہر زمانہ اور تمام اوقات میں ایک منظم اور مرتب کتاب کی شکل میں مدون تھا اور اصحاب مصاحف کے پاس اسی نظم وترتیب سے جمع تھا تو دوسری بات قابل توجہ بات ہوگی کہ ان حدیثوں سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ راوی نے جب یہ کہا کہ آل عمران پہلے پڑھی اور بقرہ بعد میں تو اس کے تحت الشعور میں یہ بات موجود تھی کہ مصحف میں اس کی ترتیب معکوس ہے، اس کی تائید من قراء قرانا معکوسا کی روایت سے ہوتی ہے یعنی قرآن میں سورتوں کی ایک ترتیب تھی جس کے خلاف پڑھنا معمول نہ تھا، اس لیے جب اس کے برعکس آپ نے نماز میں قرأت فرمائی تو یہ بات فوراً لوگوں کی نوٹس میں آگئی، اس سے ترتیب سور کی ایک مزید شہادت ملتی ہے۔

دوسرا رخ اس کا یہ ہے کہ ان احادیث سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے نماز میں مختلف رکعتوں میں سورتوں کی قرأت میں وہ ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جو مصحف میں تھی، اس لیے نماز میں سورتوں کا قرآنی ترتیب سے پڑھنا ضروری نہیں ہے لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں ترتیب سور تھی ہی نہیں، یا آپؐ نے مصحف میں ترتیب فرمائی نہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ نتیجہ کہ آنحضرتؐ نے خود سورتوں کی ترتیب نہیں فرمائی تھی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اکابر علما کی رائے ہے کہ ترتیب سور بھی اسی طرح توقیفی ہے جیسے ترتیب آیات، بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں دو ایک بزرگوں کی رائے نقل کر دی جائے:

مشہور اندلسی عالم ابن حزم ظاہری اپنی کتاب الفصل میں لکھتے ہیں:

من قال ان تقسیم الآیات وترتیب	جو یہ کہتا ہے کہ آیات کی تقسیم اور سورتوں کی
مواضع سورہ فعله الناس لیس من	جگہوں کی ترتیب لوگوں نے متعین کر دی ہے،

عنـد اللـّٰـه فـقـد كـذب هـذا جـاهـل وافكه افتراه (تاریخ القرآن رحمانی)

اللہ کی طرف سے نہیں ہے، وہ جھوٹا ہے، جاہل ہے اور اس نے افک وافترا سے کام لیا۔

ابن حزم اس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر سورتوں کی ترتیب انسانی ہوتی تو اس کے تین طریقے ہوسکتے تھے، یا تو ترتیب زمانۂ نزول کے لحاظ سے ہوتی، یا سورتوں کی مقدار (سائز) کے لحاظ سے یعنی پہلے بڑی، پھر چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی، یا اس کے برعکس پہلے چھوٹی، پھر بڑی، پھر اس سے بڑی، لیکن موجودہ قرآن کی ترتیب سوران تینوں طریقوں سے مختلف ہے اس لیے یہ ترتیب انسانی نہیں الہامی ہے۔

اگر آپ نے مستشرقین یورپ کی تحریروں کو پڑھا ہوگا تو دیکھا ہوگا کہ یہ سب بڑی شدومد سے کہتے ہیں کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب میکانیکی ہے، پہلے بڑی بڑی سورتیں لکھی گئی ہیں، پھر اس سے چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی، قرآن کا جو ایک ورقی عکسی مخطوطہ ہے اس کو دیکھیے بادی النظر میں اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے، اس مخطوطہ میں جہاں جہاں قرآن کی سورتیں ختم ہوئی ہیں وہاں سرخی سے نشانات بنائے گئے ہیں، یہ سرخ نشانات پہلے دور دور ہیں پھر قریب ہوجاتے ہیں اور پھر قریب تر۔

قرآن کی احزاب میں تقسیم والی جو روایت پیش کی جاچکی ہے، اس میں بھی کچھ ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سبع طوال سات بڑی سورتیں، پھر مائین، پھر اس سے کم سو آیتوں والی سورتیں، پھر مثانی، پھر بقیہ ان سے چھوٹی، وقس علیٰ هذا۔

عام طور پر خیال بھی یہی ہے کہ قرآن کی سورتوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پہلے بڑی، پھر اس سے چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی، اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کی جو تقسیم احزاب میں کی گئی ہے وہ بادی النظر میں مجموعی طور پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ ترتیب سور سائز کے لحاظ سے ہوئی ہے، یعنی احزاب کی مجموعی تصویر کچھ ایسی ہے کہ سورتیں اس میں اپنے حجم کے لحاظ سے مرتب ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ بات ابن حزم کو نظر نہیں آئی یا اس میں کوئی اور بات ہے جو سطحی نہیں ہے۔

احزاب کے اندر جو سورتیں ہیں، ان کے حجم پر غور فرمایئے، یہ امر متفق علیہ ہے کہ

سورۃ کا حجم اس میں آیات کی تعداد کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا ہے، آیتیں ایک حجم یا سائز کی نہیں ہیں، کوئی آیت بہت بڑی ہے، جیسے آیۃ الکرسی، کوئی بہت چھوٹی ہے جیسے قیل من راق اس لیے اگر سورتوں کا سائز آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا تو یقینی طور پر ایک سورت اور دوسری میں آیتوں کی تعداد برابر ہونے کے باوجود سائز میں فرق ہوگا لیکن چوں کہ یہ امر معرض بحث میں نہیں ہے اس لیے اس پر توجہ نہیں دی جارہی ہے، صرف بہ سبیل تذکرہ یہ عرض کر دیا گیا۔

احزاب میں سے کسی کو لے لیجیے اور ان میں سورتوں کے درمیان جو ترتیب ہے اس پر آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے غور کیجیے۔

اس وقت میرے سامنے کلام مجید کی چوتھی منزل سورۂ اسرا ہے، سورۂ فرقان تک تین آیات کی تعداد حسب ذیل ہے:

۱۔ اسراء:	۱۱۱	۴۔ طٰہٰ:	۱۳۵	۷۔ مومنون:	۱۱۸
۲۔ کہف:	۱۱۰	۵۔ انبیاء:	۱۱۲	۸۔ نور:	۶۴
۳۔ مریم:	۹۸	۶۔ حج:	۷۸	۹۔ فرقان:	۷۷

غور کیجیے کہ اس میں پہلی تین سورتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کی تعداد کے لحاظ سے سورتیں رکھی گئی ہیں، پہلے سب سے زیادہ، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم۔

چوتھی سورۃ میں آیات کی ترتیب ۱۳۵ ہے جو تمام سورتوں سے زیادہ ہے، اس کے بعد سورۂ انبیا میں ۱۱۲/ آیتیں ہیں، پھر حج میں ۷۸، مومنون میں ۱۱۸، نور میں ۶۴ اور فرقان میں ۷۷ ہیں، اگر محض تعداد آیات سے سورہ کا مقام متعین ہوتا تو طٰہٰ ایک نمبر پر ہوتی، پھر مومنون پھر انبیاء، پھر اسراء وغیرہ اور سب کے آخر میں سورۂ نور۔

قرآن کے اور احزاب کو بھی اسی طرح بالاستیعاب دیکھ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب میکانیکی ہے، کتنا اوچھا اور باطل ہے، ان خدا کے بندوں سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ذرا محنت کر کے آیتوں کی تعداد مختلف سورتوں میں دیکھ لیتے قبل اس کے کہ اس قسم کا دعویٰ کر دیتے جس کا کوئی ثبوت واقعتہً نہیں ہے۔

ہاں ایک بات ضرور اس توجیہ کی تائید میں کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ عام طور سے گنتی نہ جانتے تھے، اس لیے انہوں نے محض انداز سے سورتیں گڈمڈ کردیں جن کو بعد میں لوگوں نے گنا۔

مگر خود ان مستشرقین کے قول کے مطابق ترتیب سور ۱۲ھ میں ہوئی، جب یمامہ کی جنگ ہوچکی تھی، زکوٰۃ کی وصول یابی شروع ہوچکی تھی، جب عمال وصولی زکوٰۃ کے لیے مقرر ہوچکے تھے اور حساب کرکے کسی سے بکری کا بچہ، کسی سے غلہ، کسی سے درہم و دینار وصول کرتے تھے، جب بیت المال سے لوگوں کے وظائف مقرر ہوچکے تھے اور سب کے لیے گنتی جاننا اور حساب لگانا ضروری تھا۔

جو لاکھوں کا حساب کرسکتے تھے ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بیچارے یہ اندازہ نہیں لگاسکے کہ ۱۳۵-۹۸ سے زیادہ ہے، کس طرح قابل یقین ہوسکتا ہے۔

دوسرا قول امام مالکؒ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن جواب ہمارے پاس ہے، صحابہؓ نے اس کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھا تھا جس ترتیب سے آنحضرتؐ کو پڑھتے سنا تھا۔ (۱)

امام بغوی کہتے ہیں صحابہؓ نے قرآن کو اس ترتیب سے جمع کیا جس ترتیب سے آنحضرت ﷺ کو پڑھتے سنا گیا۔

قاضی ابوبکر کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے جس طرح آیات کی ترتیب حضرت جبرئیلؑ نے آنحضرت ﷺ کو بتائی تھی اسی طرح سورتوں کی ترتیب بھی بتائی تھی، جس قدر قرآن اتر چکتا تھا آنحضرت ﷺ ہر سال رمضان میں اس کو دہرالیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیلؑ مرتب کرادیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفا میں حضرت عثمانؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''جمع کرد قرآن را بحضور آنحضرتؐ و ترتیب دادہ بود آں را۔''

مولانا فراہی لکھتے ہیں (۲) قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں میں تنہا نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی علما کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں، چنانچہ علامہ سیوطی اتقان

(۱) تاریخ القرآن، حافظ اسلم جیراجپوری۔ (۲) تفسیر نظم القرآن، مولانا حمید الدین فراہی، طبع اول ص ۶۔

میں لکھتے ہیں ''ابوحیان کے شیخ علامہ ابوجعفر ابن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے، اس کا نام ''البرهان فی مناسبة سور القرآن '' ہے۔'' اس کے بعد سیوطی لکھتے ہیں ''نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے، اس کے اشکال کی وجہ سے علما نے اس سے بہت کم بحث کی ہے، امام فخر الدین رازی تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے، انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب ونظم کے اندر چھپا ہوا ہے۔''

خود مجھے امام رازی کی تفسیر کبیر میں آیت ولو جعلناه قرآنا عربيا الآية حم سجدہ کے تحت نظم قرآن سے متعلق ان کا مندرجہ ذیل بیان ملا۔

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ روایت ہے کہ کفار نے ازراہِ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے۔

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں باہم دگر کوئی تعلق نہیں ہے، یہ چیز قرآن مجید پر ایک بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے، اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کا ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا، ہم اس کے ایک منظّم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: (ملحدین نے) قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا اور میں نے دیکھا کہ علمائے اسلام اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ حق کا اظہار کرتے اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کرتے، اس قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں ملحدین کہہ رہے تھے، كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا، پھر اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کیا اور اس کی توضیح طلب مقامات کی تشریح فرمائی جیسا کہ سورۂ قیامہ میں آیا ہے إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، آگے چل کر امام سیوطی کا قول نقل کرتے ہیں:

پہلے شخص جنھوں نے اپنے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا، شیخ ابوبکر نیشاپوری ہیں، وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں کے پہلو میں

کیوں لکھی گئی اور فلاں سورہ فلاں سورہ کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورہ کے فلاں سورہ کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے۔

ہمارے یہاں کے علما میں فراہی نے نظم قرآن پر بڑی توجہ دی ہے اور نہ صرف آیات میں ربط کا کھوج لگایا بلکہ سورتوں میں باہمی مناسبت کی بھی نشان دہی کی ہے، سورۂ والعصر کی تفسیر کے سلسلہ میں اس سورہ کا تعلق ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے ظاہر کیا ہے، یہ تین آیتوں کی سورہ ہے، اس کے پہلے سورۂ تکاثر آٹھ آیتوں کی اور مابعد کی سورۂ ہمزہ نو آیتوں کی ہے، ظاہر ہے کہ ان سورتوں کا نظم تعداد آیات کے لحاظ سے تو نہیں ہے، مولانا فراہی فرماتے ہیں:

''سورۂ تکاثر میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت وجاہ طلب مال وعیش دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہیں، ان کی زندگی اور زندگی کے تمام سرگرمیوں کا محور بس دنیا ہے جس کے عشق میں انہوں نے اپنی عمریں گنوادیں، حالاں کہ اس سے بڑھ کر کوئی بدبختی و نامرادی نہیں ...... والعصر، ابتدائے سورہ میں ان لوگوں کی نامرادی کو بیان کیا ہے جو عشق کے دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں، پھر اصل کامیابی کی طرف اشارہ کیا کہ اس عمر فانی کے اندر نیکی اور سچائی کے زندگی بسر کر کے یہ دولت جاوداں حاصل کی جاسکتی ہے، پس لوگوں کو چاہیے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و سرمستی کی نیند سے بیدار ہوکر حسرت و افسوس کی ساعت سے پہلے اس چیز کی سعی وطلب میں مشغول ہوں جو چاہنے کی ہے، بعد والی سورۂ ہمزہ میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں یہ ارباب نعمت مبتلا ہوں گے، پس یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی تاکہ ان کی آرزوؤں کی ناکامی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے۔(۱)

مولانا بحرالعلوم شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ''قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے اس لیے کہ ان دس قاریوں نے جس کی فہرست قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، ایسی صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے قرآن کو اس ترتیب سے نقل کیا۔''

---

(۱) تفسیر سورۂ والعصر، طبع اول، ص ۶، ۸، ۳۔

یہ چند رائیں ہیں جو مشتے نمونہ از خروارے، صرف اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ جن لوگوں نے عمریں کلام مجید پر غور خوض کرنے میں صرف کی ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نظم قرآن میں سورتوں کی ترتیب محض اندازہ سے نہیں ہے بلکہ ایک بلند و بالا اسکیم کے ماتحت ہے اور یہ رائیں ایسی نہیں ہیں جنہیں سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔

اگر چہ یہ میرا منصب نہیں ہے مگر صرف اس خیال سے کہ بات ادھوری نہ رہ جائے، ان روایات پر جن سے یہ شبہہ لاحق ہوتا ہے کہ ترتیب سور آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں مکمل نہیں ہوئی تھی تنقید روایت کے لحاظ سے غور کیا جائے۔

اس سلسلہ میں بڑی بے لاگ تنقید مولانا عبداللطیف صاحب رحمانی نے تاریخ القرآن میں کی ہے، اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، کچھ روایات ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں قرآن کی آخری دو سورتیں نہ تھیں اور آپ قرآن سے ان سورتوں کو مٹا دیا کرتے تھے۔

معوذتین کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ سے تین شخصوں کی روایتیں ہیں:

۱۔ عبدالرحمٰن بن یزید ۲۔ علقمہ ۳۔ زر بن حبیش۔

عبدالرحمٰن کی روایت کو ابن کثیر نے تفسیر میں اور اتقان میں ابن حجر سے نقل کیا ہے، اتقان میں مصاحفہ کی جگہ من المصحف ہے، روایت یہ ہے:

عبدالله بن ابی احمد من حدیث الاعمش عن ابی اسحق عن عبدالرحمن بن یزید قال کان عبد الله یحك المعوذتین من مصاحفه ویقول انها لیستا من آیات الله۔	عبداللہ بن ابی احمد نے اعمش کی حدیث کو ابواسحٰق سے اور انہوں نے عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو مصاحف سے مٹا دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دونوں آیات اللہ سے نہیں ہیں۔

دوسری روایت امام نخعی کی حسب ذیل ہے:

عبد الله بن احمد عن عبد الرحمن بن یزید قال کان عبد الله یحك	عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو صحیفہ سے مٹا دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اکرمؐ نے

المعوذتين من المصحف ويقول انما امررسول الله ان يتعوذ بهما ولم يكن عبد الله يقرأ بهما ويقول انها ليستا من كتاب الله۔

حکم دیا ہے کہ ان دونوں کے ذریعہ پناہ طلب کی جائے اور عبداللہؓ اسے پڑھتے نہیں تھے اور کہتے تھے کہ وہ دونوں سورہ کتاب سے نہیں ہیں۔

قسطلانی نے شرح بخاری میں نخعی کی ایک روایت یہ نقل کی ہے:

واخرج عبدالله بن احمد فی زيادات المسند والطبرانی وابن راوية من طريق الاعمش عن ابی اسحاق عن عبدالرحمن بن يزيد النخعی قال كان عبد الله بن مسعود يحك المعوذتين من مصاحفه ويقول انهما ليستا من القران ومن كتاب الله۔

(عینی شرح بخاری)

عبداللہ بن احمد نے مسند کی زیادات میں تخریج حدیث کی ہے اور طبرانی اور ابن راویہ نے اعمش کی سندوں سے ابواسحاق کے حوالے اور عبدالرحمٰن بن یزید النخعی سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو اپنے مصحف سے مٹا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دونوں قرآن میں سے نہیں یا کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں۔

علقمہ کی روایت یہ ہے:

قال حدثنا الارزق بن علی ثنا حسين ابن ابراهيم ثناالصلت بن بهرام عن ابراهيم عن علقمة قال كان عبد الله يحك المعوذتين من المصحف ويقول انما امر رسول الله ان يتعوذ بهما ولم يكن عبد الله يقرأ بهما۔

ہم سے ارزق بن علی نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حسین بن ابراہیم نے روایت کی اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سے صلت بن بہرام نے اور ان سے ابراہیم نے اور ابراہیم نے علقمہ سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو مصحف سے مٹا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے کہ اس سے تعوذ کیا جائے لیکن عبداللہ اس کو پڑھتے نہیں تھے۔

تفسیر ابن کثیر اور قسطلانی شرح بخاری کی ایک روایت یہ ہے:

واخرج الطبرانی عن ابن مسعودؓ ان النبیؐ سئل عن هاتین المعوذتین فقال قیل لی فقلت فقولوا کما قلت۔ (درمنثور)

عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے طبرانی نے تخریج کی ہے کہ رسول اکرمؐ سے ان دونوں معوذتین کے متعلق دریافت کیا گیا، پس آپ نے فرمایا کہ مجھ سے بھی یہی کہا گیا، پس میں نے کہا اس لیے تم بھی کہو جیسا کہ میں نے کہا۔

زر بن حبیش کی روایت یہ ہے:

قال حدثنا وکیع ثناسفیان بن عاصم زر بن حبیش قال سألت عن ابن مسعود عن المعوذتین فقال سألت النبیؐ عنهما فقال قیل لی قل فقلت لکم فقولوا قال لی فقال النبی فنحن نقول (ابن کثیر)

میں نے ابن مسعودؓ سے معوذتین کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریمؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ تم کہو پس میں نے تم سے کہا، اس لیے تم بھی کہو پس ہم بھی کہتے ہیں۔ (اس کی تشریح اگلی حدیث میں آتی ہے)

دوسری روایت یہ ہے:

قال الامام احمد حدثنا عفان ثنا حماد بن سلمة ابا عاصم بن بهدله عن زر بن حبیش قال قلت لابی بن کعب ابن مسعود لایکتب المعوذتین فی مصحفه، اشهد ان رسول اللّٰه اخبرنی ان جبرئیل قال له قل اعوذ برب الفلق فقلتها قال اعوذ برب الناس فقلتها فنحن نقول ما قال النبیؐ
(ابن کثیر، مسند امام احمد)

زر بن حبیش سے روایت ہے کہ میں نے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ ابن مسعودؓ معوذتین کو مصحف میں نہیں لکھتے تھے، میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہؐ نے مجھے بتایا کہ جبرئیل نے ان سے معوذتین پڑھنے کو کہا تو میں نے دونوں سورتوں کو پڑھا تو ہم بھی وہی کہتے ہیں جو نبی کریمؐ نے کہا۔

تیسری روایت یہ ہے:

عن سفیان بن عیینة ثنا عبده ابی لبابة وعاصم بن عبد اللّٰہ انهما عن زر بن حبیش قال سألت ابی بن کعب عن المعوذتین فقلت یا ابا المنذر ان لقاك ابن مسعود یحك المعوذتین من المصحف فقال انی سألت رسول اللّٰہ قال قیل لی فقلت فنحن نقول کما قال رسول اللّٰہ

(مسند ابو بکر بن حمیدی)

ابی بن کعبؓ سے معوذتین کے متعلق میں نے دریافت کیا پس میں نے کہا کہ اے ابوالمنذر تمہارے بھائی ابن مسعودؓ معوذتین کو اپنے مصحف سے مٹادیا کرتے تھے تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا ہے، میں نے اسے کہا پس ہم بھی ویسے ہی کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

چوتھی روایت یہ ہے:

حدثنا علی بن عبد اللّٰہ ثنا سفیان ثنا عبده ابی لبابة عن زر بن حبیش قال سفیان وحدثنا ایضاً عاصم عن زر مثله، قال سألت ابی بن کعب فقلت یا ابا المنذر ان اخاك ابن مسعود یقول کذا و کذا فقال انی سألت النبیؐ فقال قیل لی فقلت فنحن نقول کما قال رسول اللّٰہؐ (بخاری)

میں نے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ ابوالمنذر تمہارے بھائی ابن مسعودؓ ایسی ایسی بات کہہ رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے نبی کریمؐ سے دریافت کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا ہے تو میں نے بھی کہا تو اب ہم کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا۔

اس پر مولانا رحمانی کی تنقید حسب ذیل ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تینوں راویوں میں سے صرف عبدالرحمٰن ابن مسعود کا قول (انهما لیستا من کتاب اللّٰہ) نقل کرتے ہیں اور دوسرے راوی نقل نہیں کرتے، عبدالرحمٰن چوں کہ اس روایت میں منفرد ہیں اور یہ روایت احادیث متواترہ کے خلاف

ہے، اس لیے ان کی روایت قابل قبول نہیں، عبدالرحمٰن سے راوی ابو اسحاق ہے جس کے متعلق میزان الاعتدال کی روایت ہے کہ اہل کوفہ سے صحیح روایت نہیں کرتا، ابو اسحاق سے راوی اعمش ہیں جو بقول میزان الاعتدال مدلس ہیں اور ان کی حدیثوں میں بہت اضطراب ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ابن مسعودؓ صحابہ میں ممتاز، فاضل اور ذی کمال صحابی ہیں، کوفہ میں دارالعلوم انہی کا تھا، ان کے ہزاروں شاگرد تھے مگر ان شاگردوں میں سے کوئی بھی یہ روایت نہیں کرتا بلکہ شاگردوں کی جو روایتیں ہیں وہ اس کے برخلاف حضرت ابن مسعودؓ قرآن کا درس مع معوذتین دیتے تھے، ان میں ایک روایت جس کی سند بہت عمدہ ہے، درمنثور میں حسب ذیل ہے: "واخرج الطبرانی ابن مسعود عن النبیؐ قال لم......انزل علی ایات لم ینزل مثل المعوذتین" اگر بالفرض ابن مسعودؓ نے انکار کیا ہوتا تو یہ ایک مہتم بالشان قضیہ ہوتا اور تواتر سے لوگ اس کی روایت کرتے، علاوہ ازیں معوذتین کے متعلق صحاح میں متواتر روایتیں ہیں۔

علقمہ کی روایت میں ایک راوی ارزق بن علی ہیں جو غریب حدیثوں کی روایت کرتے ہیں اور صحاح میں ان سے روایت نہیں کی گئی، دوسرے حسین بن ابراہیم ہیں جو امام نسائی کے نزدیک قابل وثوق نہیں، تیسرے الصلت بن ابراہیم ہیں جن سے صحاح میں روایت نہیں کی گئی۔

زر بن حبیش کی روایت میں اضطراب اور اختلاف ہے، ابن کثیر کی روایت میں زر کا بیان ہے کہ معوذتین کو میں نے ابن مسعودؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے انہیں رسول خداؐ سے دریافت کیا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ انہیں پڑھو، میں نے بھی انہیں پڑھا ہے، اس لیے تم بھی پڑھو، پھر زر نے ابیؓ سے دریافت کیا، ابیؓ نے بھی بعینہٖ یہی جواب دیا۔

دوسری روایت امام بخاری نے علی بن عبداللہ کے واسطہ سے نقل کی ہے، اس میں زر نے ابیؓ سے محض عبداللہ کا قول نقل کیا ہے لیکن اس قول کی کچھ تفصیل نہیں ہے، صرف اس

قدر ہے کہ ابن مسعودؓ فلاں فلاں بات کہتے ہیں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زر نے وہی مقولہ نقل کیا ہے جو امام احمد نے وکیع کے واسطہ سے بیان کیا ہے۔

ابوبکر حمیدی کی روایت میں "یحك المعوذتين من المصحف" اور چوتھی میں "لا يكتب المعوذتين في مصحفه" دونوں بیان مختلف ہیں۔

علامہ بحر العلوم عبدالعلی ابوالعیاش لکھتے ہیں جن روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابہ کی ترتیب اس قرآن کے خلاف تھی، وہ تمام وہمی اور خیالی ہیں، کسی معتبر کتاب میں ایسی روایت نہیں۔(۱)

حافظ اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں جو روایت ترتیب مصاحف ابی بن کعبؓ وعبداللہ ابن مسعودؓ ہیں وہ کسی طرح قابل اعتماد نہیں کیوں کہ یہ روایت حدیث کے طبقۂ چہارم سے بھی ادنیٰ درجہ کی کتابوں میں ہے، کسی مستند حدیث کی کتاب میں نہیں۔(۲)

ابن حزم لکھتے ہیں معوذتین کے متعلق وہ روایتیں جن سے ابن مسعودؓ کا انکار ثابت ہوتا ہے محض افترا اور جعل ہیں کیوں کہ ابن مسعودؓ سے عاصم کی روایت میں جو نہایت صحیح ہے معوذتین ہیں اور یہ بات کہ ابن مسعودؓ کا قرآن ہمارے موجودہ قرآن سے مختلف ہے محض بہتان، افترا اور جھوٹ ہے اور یہی رائے تمام ائمہ دین کی ہے جس میں قاضی ابوبکر، امام فخر الدین رازی اور محی الدین نووی وغیرہ سب شامل ہیں۔

ایک روایت اس سلسلہ میں حسب ذیل ہے:

قال قلت لعثمان ما حملكم على ان عمدتم الى الانفال وهم من المثاني وبرأة وهي من المئين فترة تم بينهما ولن تكتبوا بينهما سطر بسم الله الرحمن الرحيم ووضعتموها في سبع طوال۔	میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ آپ کو کس بات نے اس چیز پر آمادہ کیا کہ انفال جو کہ سبع مثانی میں سے ہے اور براۃ جو مئین میں سے ہے، ان دونوں کے درمیان ختم ہوجاتا ہے، آپ نے فصل کے طور پر بسم اللہ کیوں نہیں لکھی اور اسے آپ نے سبع طوال میں رکھ دیا؟

(۱) رحمانی ص ۲۱۔ (۲) تاریخ القرآن ص ۳۷، ۳۸۔

فقال عثمان، كان رسول اللّٰہ ینزل علیه السور ذوات العدد فكان اذا تنزل علیهم الشیئ دعا بعضهن كان یكتب فیقول ضعوا هؤلاء الآیات فی السورة التی یذكر فیها كذا و كذا، و كانت الانفال من اوائل ما نزل بالمدینة و كانت البرأة من آخر القرآن نزولا و كانت قصتها بشبهة بقصتها فظننت انها منها فقبض رسول اللّٰہ ولم یبین لنا انها فمنها اجل ذلك قرنت بینهما ولم اكتب بینهما سطر بسم اللّٰہ وضعتها فی السبع الطوال۔

حضرت عثمانؓ نے جواب میں فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ پر متعدد سورتیں نازل ہوتیں تو آپؐ کاتبان وحی میں سے کسی کو طلب فرما کر حکم دیتے تھے کہ ان آیتوں کو اس سورہ میں رکھو جیسا کہ آپ تذکرہ فرماتے، انفال ان سورتوں میں ہے جو مدینہ کے اوائل میں نازل ہوئی، نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی آخری سورۂ برأۃ تھی، چنانچہ اس کا شان نزول بھی انفال کے مشابہ ہے، اس بناپر میں نے خیال کیا کہ برأۃ بھی انفال ہی کا جزو ہے اور اس درمیان میں نبی کریمؐ کی وفات ہوگئی اور یہ مسئلہ آپ نے واضح نہیں فرمایا کہ سورہ اسی کا جزو ہے، چنانچہ اس وجہ سے میں نے ان کو آپس میں ملا دیا اور اس کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور اسے سبع طوال میں رکھا۔

اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، حاکم نے روایت کی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کی رائے سے ہوئی۔

ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث ظنیہ ہے اور صرف عوف نے یزید سے روایت کی ہے، عوف اگر چہ محدثین کے نزدیک معتبر ہے مگر تہذیب التہذیب میں انہیں دو وجہوں سے نا قابل اعتبار ٹھہرایا ہے، اس کے علاوہ یزید فارسی مجہول شخص ہے اور امام مسلم اور بخاری نے اس سے روایت نہیں کی ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ حدیث ان متواتر حدیثوں کے خلاف ہے جن میں برأۃ کو مستقل سورہ شمار کیا گیا ہے، اس

روایت میں درایتاً بھی یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے انفال کو براۃ کے ساتھ ملا کر کیوں لکھا اور بیچ میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی اور یہ سوال و جواب ۲۵ھ کے بعد ہوا، جب حضرت عثمانؓ کے حکم سے قرآن کے مستند نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ۱۲ھ اور ۲۵ھ یعنی تیرہ چودہ برس کے عرصہ میں جب حضرت زیدؓ قرآن کا مستند نسخہ لکھ کر خلیفۂ وقت کو دے چکے تھے تو اس لمبے عرصہ میں کیا لوگوں نے مختلف الترتیب نسخے جمع کیے تھے اور تمام نسخے اور اس نئے نسخہ کے سامنے کالعدم قرار دیے گئے اور ایسے نیست ونابود کیے گئے کہ ان کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا اور یہ حضرت ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی زندگی اور ان کے علم میں ہوا مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

ایک طرف تو صحابہ کرام کی یہ ذہنیت تھی کہ جب حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ نے زیدؓ سے کہا کہ قرآن کو بین الدفتین جمع کر دو تو زیدؓ نے جواب دیا کہ آپ مجھے ایسا کام کرنے کے لیے کیسے کہہ سکتے ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کہا تھا، دوسری طرف یہ ذہنیت ہے کہ جب یہ آمرانہ حکم خلیفہ کی طرف سے صادر ہوتا ہے جو میرا مصحف اور میری بیاض ہے بس وہی اصل اور درست مصحف ہے، اس کے خلاف جو بھی صحیفہ ہو اسے ضائع کر دیا جائے تو کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ یہ کہہ سکے کہ تم اس کام کا کیسے حکم دے سکتے ہو جو رسولِ خداؐ نے نہیں کیا تھا۔

پھر ذرا اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ وصالِ نبویؐ کے چودہ پندرہ سال بعد جب ''بیاض عثمانی'' مرتب کی جاتی ہے تو ہر سادہ لوح خلیفہ انفال اور برأت کو ایک ساتھ ملا دیتا ہے کہ ان دونوں کا مضمون مشابہ ہے، اسی لیے دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھا مگر ان کو دو مستقل سورتوں کی حیثیت سے قائم رہنے دیتا ہے، اس اجتہاد سے پہلے اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ زید کا مصحف یا ابن مسعود کا مصحف منگا کے دیکھ لے کہ ان میں ترتیب کیا ہے اور یہ دونوں علاحدہ علاحدہ سورتیں ہیں یا نہیں۔

اس سے پہلے زیادہ مزیدار روایت وہ ہے جو حضرت انسؓ کی جانب منسوب ہے، اس میں کہا جاتا ہے کہ حضرت حذیفہؓ جب آذربائیجان کے معرکہ سے واپس آئے تو انہوں نے

خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کو شام اور عراق والوں کے اختلافہم فی القرآن کی طرف توجہ دلائی اور کہا:

یاامیرالمومنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب کما اختلف الیهود والنصاریٰ	اے امیرالمومنین اس وقت کا معاملہ سنبھالیے قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے بارے میں ان میں اس قسم کا اختلاف شروع ہو جائے جس طرح سے یہود ونصاریٰ نے اختلاف کیا۔

تو حضرت عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے یہاں سے حضرت زیدؓ کا مرتب کیا ہوا نسخہ منگایا اور زید بن ثابتؓ، سعید بن العاصؓ، عبدالرحمٰن الحارثؓ بن ہشام اور عبداللہ بن زبیرؓ کو متعین کیا کہ:

"انسخوا الصحف فی المصاحف وقال لرهط القرشیین الثلاثة اختلفهم انتم وزید بن ثابت فاکتبوا بلسان قریش فانها نزل بلسانهم۔"

یعنی حضرت زیدؓ کا لکھا ہوا جو مستند نسخہ ام المومنین کے پاس تھا، اس کو منگا کے ان حضرات کو دیا گیا کہ اس کی نقلیں تیار کر دو اور یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم لوگوں کو زیدؓ کے نسخہ کی کسی چیز سے اختلاف ہو تو اس کو قریش کی زبان کے مطابق لکھو کیوں کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا۔

غور فرمایئے یہاں صرف سوال کتابت کا ہے، مثلاً زیدؓ نے ملك یوم الدین لکھا، اختلاف اگر نقل کرنے والے کو ہو سکتا ہے تو صرف رسم الخط سے ہو سکتا ہے یعنی اسے "مالك یوم الدین" لکھنا چاہیے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ بجائے مالك کے کوئی دوسرا لفظ قریش کی زبان کا یہاں رکھ دیا جائے، یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ام المومنین کے نسخہ میں ایک لفظ ہو اور لکھنے والے اس کے بجائے دوسرا لفظ لکھ دیں، تحریف قرآن کا چارج تو آج تک کسی پڑھے لکھے نے نہیں لگایا۔

اس روایت میں حیرت انگیز ٹکڑا حسب ذیل ہے:

قال الزهری حدثنی خارجة بن زید ان زید بن ثابت فقد اٰیة من سورة	زہری نے کہا کہ مجھ سے خارجہ بن زید نے بیان کیا کہ زید بن ثابتؓ سے سورۂ احزاب کی

الاحزاب کنت سمعت رسول اللّٰہ یقرأھا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ فالتمستها فوجدتها مع خزيمة بن ثابت وابی خزیفة فالتحقیقها فی سورتها۔	ایک آیت گم ہوگئی، میں نے اسے نبی کریم ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا تھا وہ آیۃ من المومنین الخ تھی، چنانچہ میں نے اس کی جستجو کی تو اسے خزیمہ بن ثابت اور ابوخزیمہ کے پاس پایا اور اس کو احزاب میں ملحق کر دیا۔

کوئی تیرہ چودہ برس بعد جب قرآن کا تیسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا اور حضرت زیدؓ کو ان کا لکھا ہوا کلام مجید جو اس وقت تک خلیفۂ اول ودوم اور ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس جزدان میں رکھا ہوا تھا، قرآن کے دوسرے نسخے تیار کرنے کے لیے جب نکالا گیا، اس وقت زیدؓ نے اپنے رفقائے کار یا اور جلیل القدر صحابی سے نہیں بلکہ اپنے بیٹے سے اس راز سربستہ کا انکشاف کیا کہ اس نسخہ میں ایک آیت سورۂ احزاب کی نہیں ہے اور اس آیت کو ڈھونڈنے لگے، حالاں کہ اس وقت ہزاروں نسخے کلام مجید کے دیار عرب میں مستعمل تھے مگر کسی میں یہ آیت نہ ملی، بڑی تلاش وجستجو کے بعد خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی، خزیمہؓ ایسے محتاط جامع قرآن تھے جنہوں نے قرآن کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت سورۂ برأت کی ایک گم شدہ آیت لقد جاء کم رسول الخ بھی زیدؓ کو فراہم کی تھی لیکن جب زیدؓ نے دوسرا ایڈیشن مرتب کیا تھا تب بھی ان کو یاد نہ آیا سورۂ احزاب کی بھی ایک آیت کھوئی ہوئی ہے اور ۱۳؍ برس بعد جب اپنا مرتب کیا ہوا قرآن دیکھا، اس وقت ان کے حافظہ نے کام دیا اور وہ آیت دفعۃً یاد آگئی یعنی پورے تیرہ سال بعد یاد آگئی، اسی لیے علما نے ایسی روایتوں پر تنقید کی ہے، چنانچہ زہری کی زید بن ثابتؓ والی روایت جو پہلے پیش کی جا چکی ہے اس کی سند کے بارے میں مولانا رحمانی لکھتے ہیں کہ یہ خبر احاد میں سے ہے، زہری اگرچہ محدثین کے نزدیک نہایت معتبر، قابل وثوق، راست باز اور امین ہیں اور تمام کتب صحاح میں ان کی روایتیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ مدرج تھے یعنی اپنے کلام کو حدیث میں اس طرح ملا کر

بیان کر دیتے تھے کہ سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی حدیث ہی ہے، چنانچہ المختصر میں ہے:

فانه كان يخلط كلامه بالحديث ولذلك قال له موسىٰ بن عقبة افصل كلام رسول الله من كلامك

امام زہری اپنے کلام کو حدیث میں خلط ملط کر دیا کرتے تھے، اسی بنا پر موسیٰ بن عقبہ نے ان سے کہا کہ اپنے کلام کو رسول اللہ ﷺ کے کلام سے الگ کر لیا کرو۔

آگے چل کر مولانا رحمانی لکھتے ہیں کہ اس روایت اور امام بخاری نے کتاب الاحکام میں ابن شہاب زہری سے ابراہیم بن سعد کی جو روایت نقل کی ہے ان دونوں میں حسب ذیل اختلافات ہیں، اختلاف خط کشیدہ ہیں:

زہری سے شعیب کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

۱۔ قد استحر يوم اليمامة بالناس

۲۔ من الرقاع والاكتاف والعسيب

۳۔ حتى وجدت من سورة التوبة، آيتين

۴۔ مع خزيمة الانصارى

۵۔ لم اجدها مع احد غيره

زہری سے ابراہیم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قد استحر يوم اليمامة لقراء القرآن

من العسيب والرقاع واللخاف

فوجدت أخر سورة توبة

مع خزيمة اور ابى خزيمه

یہ الفاظ نہیں ہیں۔

فالحقتهما فى سورتهما۔

ان اختلافات کے باوجود اگر یہ حدیث صحیح مان بھی لی جائے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، اس میں جمع قرآن سے کتابت قرآن نہیں بلکہ ایک مستند قرآنی نسخہ تیار کرنا مقصود ہے۔

کتاب اللہ پر لکھنے والوں کی کمی نہیں، بے شمار لوگوں نے اپنی پوری کی پوری زندگی اس سعادت کو حاصل کرنے میں صرف کردی ہے، اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو چکی ہو اور اب کوئی نئی بات کہنا ناممکن ہے، پھر بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا تابع مہمل کی حیثیت سے ہی سہی باعث افتخار ہے، یہی جذبہ اس مقابلہ کا محرک ہوا۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

●●●●●

ISBN : 978-93-80104-04-1

9 789380 104041